فلسفۂ قرآن مجید

در

شانِ نزولِ فرقانِ حمید

تصنیف

پیر صاحب دیول شریف

بسم اللہ تعالیٰ

اقرا باسم ربک الذی خلق

پڑھ! اپنے (اُس) رب کا نام لے کر جس نے پیدا کیا

فلسفہ قرآن مجید

در

شانِ نزولِ فرقانِ حمید

قرآن عظیم کے چودہ سو سالہ جشن نزول کے موقع پر مملکتِ خُداداد پاکستان کے رُوحانی پیشوا:-

حضرت خواجہ محمد عبد المجید احمد قادری خضری (پیر صاحب دیول شریف) مدظلہ العالی

کی پیش کردہ:

جامع، مبسوط اور پُر حقیقت تصنیف

مرتبہ

صاحبزادہ محمد معین الدین احمد فرزندِ اکبر پیر صاحب دیول شریف

ناشر:- آستانہ عالیہ خضریہ قادریہ فیض آباد راولپنڈی (مغربی) پاکستان

باسمہٖ سبحانہٗ

میں نے اپنی اِس تالیف و ترتیب کو
علما و مفکّرینِ قوم کے نام معنون کرتا ہوں

محمد عبد الحمید

راولپنڈی { ۹؍ شعبان : ۱۳۸۷ھ
یکم نومبر : ۱۹۶۸ء

زندگی کی زیبِ و زینت کے لیے قرآن ہے
جو وجودِ ذاتِ باری کے لیے برہان ہے

غمگسارِ آبِ و گل اس ذات کا فرمان ہے
ایک اُمّی پر جو اُترا ہے وہی قرآن ہے

نقطہ نقطہ کے لیے بیکل ہے قلبِ مضطرب
جس قدر کھو جاؤں اس میں وسعتِ ایمان ہے

ژالہ باری چشمِ تر سے ہے نظرِ قرآن پر
اہلِ دل، اہلِ نظر کی بس یہی پہچان ہے

آخرِ دم بھی نظر ہے سورۂ اخلاص پر
مژدہ اے ذوقِ نظر منزل بہت آسان ہے

تیری رحمت کے میں صدقے نعمتِ قرآن دی
ذرۂ خاکی پہ تیرا کس قدر احسان ہے

وشائیں بھی تیری بخشش ہیں تیرا لطف ہیں
نورِ عرفاں ہے کہ جس سے آدمی کی شان ہے

یا قرار آتا ہے دل کو نام لے لے کر تیرا
یا محمد مصطفٰے وجہِ سکونِ جان ہے

جمگھٹے رہتے ہیں جلووں کے معینِ اکثر یہاں!
طورِ سینا ہے کہ یہ دل وادیٔ فاران ہے

صاحبزادہ محمد معین الدین معین

گر تو مے خواہی مُسلماں زیستن

نیست ممکن جُز بہ قُرآں زیستن

حکیم الامت علاّمہ اقبال علیہ الرحمۃ

سلسلۂ مطبوعات

بارِ دوم : ——— ۱۰۰۰

قیمت : ——— دو روپے

خوشنویس : ——— محمد سلیم ساغر راولپنڈی

مطبع : ——— نقوش پریس لاہور

خلیفہ محمد نذیر ناظمِ نشر و اشاعت ۳۸ علامہ اقبال روڈ لاہور (پاکستان)

ترتیب

پیش لفظ

ھجری ۱۳۸۷ مطابق ۱۹۶۸ عیسوی اس لحاظ سے قابلِ صد افتخار سال ہے کہ اس میں دُنیا بھر کے مسلمانوں نے قرآنِ مقدس کی چودہ سو سالہ تقریب کا جشن پوری آب تاب سے منایا۔ یہ ایک مُبارک و نیک فال ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اپنی آسمانی کتاب کی طرف پُرجوش رُجوع کر رہے ہیں۔ قریبًا نصف صدی کی بات ہے، جب مسلمانوں میں سیرتُ النّبی صلّی اللہ علیہ و اصحابہ وسلّم کے موضوع پر مجالس کے انعقاد کی تحریک شروع ہوئی اور اب ہر سال عالم اسلام میں عید میلاد النّبی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم منائی جاتی ہے۔

جشنِ نزُولِ قرآن کے سلسلہ میں عالم اسلام میں جو اہم اجتماعات منعقد ہوئے۔ اُن میں غالباً سب سے اہم اجتماع وہ تھا جو ۱۰ فروری کو اسلام آباد میں شروع ہوا جس میں مسلم دُنیا کے دینی فضلائ، اور جدید عہد کے علمائے کرام محققین و مُفکرین، نیز صُوفیائے عظام نے شرکت کی۔ تاجدار مدینہ رحمۃُ للعالمین صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے توسّل سے انسانیت کی رہنمائی کے لیے خدائے بزرگ و برتر کے عطا کردہ آئینِ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہر مکتب فکر کے لوگوں نے لکھا پڑھا اور اس صحیفۂ آسمانی کو خراجِ عقیدت و تحسین پیش کیا۔

عمدۃُ العارفین، سراجُ السّالکین، بُرہان المحققین، مُرشدِ پاکستان، خواجۂ خواجگان اعلیٰ حضرت شیخ المشائخ محمّد عبدالمجید احمد مدظلہ العالی پیر صاحب دیول شریف کا نام نامی اور اسم گرامی

بھی اُن ہستیوں میں سرِفہرست تھا۔ زیرِنظر تصنیف حضرت ممدوح کے ۱۲ اعالی قدر مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو حضور قبلہ وکعبہ نے اسی تقریبِ سعید کے لیے دو تین نشستوں میں قلم بند کرائے۔

اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ دُنیا میں اِسلام اور قرآن کی سب سے زیادہ خدمت اہلِ نظر اہلِ اللہ نے اور ان کے بلیغ النظر ارادتمندوں نے انجام دی ہے قرآن مجید کو دُنیا کے کونے کونے میں پہنچانے اور اسلامی تعلیمات کے احیائے کے لیے علمائے علام صُوفیائے عظام اور اولیائے کرام نے انجام دیا۔ جو اسلام کی بڑی خدمت ہے۔ حقیقتاً ان مقدسین کے کارناموں کی صدائے بازگشت سے دُنیا کے مسلمان دین کی ابدی نعمتوں کے حامل بن گئے۔

حضرت قبلہ پیر صاحب کا وجودِ بابرکت ملّت کے افکار میں پراگندگی کو روکنے اور مسلمانوں کو رسولِ عربی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے قریب تر کرنے کے لیے ایک مسلسل جہادِ عظیم میں مصروف ہے۔ آپ مدّت سے مسلمانوں کے دِلوں میں عشقِ الٰہی اور عشقِ رسُول پاک صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی قندیلیں روشن کر رہے ہیں۔ عظمتِ اسلام و عظمتِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور ملّتِ اسلامیہ کے لیے ایثار و محبّت کا درس دے رہے ہیں۔

اِن پُر حقائق مضامین میں قرآنِ حکیم کی حُسنِ ترتیب اور رُوحانی، سیاسی، اور اخلاقی تعلیمات کی کہیں اشاروں، کنایوں میں، کہیں برملا اور کہیں تمثیلات میں ایسے احسن طریق سے رقم فرمایا ہے۔ جس کے پڑھنے سے طمانیّت و سکُون ملتا ہے۔

آپ نے اس تصنیف میں ثابت کر دیا ہے کہ قرآن سے بہتر کوئی دستورالعمل انسان کے

پاس موجود نہیں جو ایک ہمہ گیر قانون اور ایک زبردست تحریکِ عمل ہے۔ قرآن کریم کا مخرج وہ ہستی ہے جس کی ابتدا و انتہا کسی نے نہیں پائی۔ قرآن معبودانِ باطل کی طرف سے پھیر کر خدائے واحد کی طرف انسان کو لاتا ہے۔ اس کا مقصدِ اولین توحیدِ الٰہی ہے۔ قرآن ہی مسلمانوں کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ قرآن میں وہ تمام آداب و اصولِ حکمت اور فلسفہ موجود ہیں۔ جن کی ضرورت انسان کو ہر زمانہ میں رہے گی۔ قرآن قطعی طور پر ایک عملی مذہب پیش کرتا ہے اور اس کے بغیر دنیا کا امن و امان قائم نہیں رہ سکتا۔

دنیا میں صرف قرآن ہی ایک قانونِ فطرت ہے۔ جس کے ذریعے انسان بیک وقت روحانی اور دنیاوی ترقی پا سکتا ہے۔ قرآن قدیم و جدید صداقتوں کا مظہر ہے جو ایک تخیل نہیں بلکہ مستقل لائحہ عمل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی تعلیمات نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا اور صدیوں کی گمراہی لمحوں میں کافور ہو گئی۔ قرآن ہر زمانے میں ہر سلطنت اور ہر جماعت کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس میں ایک وسیع جمہوریہ کے لیے تمام آئین اور فرامین موجود ہیں۔ یہ راعی اور رعایا دونوں کے لیے کافی ہے۔ اس کے احکام کے مطابق دنیا پر حکومت ہونی چاہئے۔ جس کے لیے عالم اسلام میں بالخصوص حکومت پاکستان کوشاں ہے۔ کیونکہ قرآن کا قانون اصولِ فطرت کے مطابق فلاح کے لیے عالمگیر حکومت کے ساتھ امن و عافیت چاہتا ہے اور اس پر عمل کرنے سے مسلمانوں کو سارے جہاں کے انسانوں پر امامت و خلافت مل سکتی ہے۔ دینِ کامل آچکا، دینِ کامل نافذ بھی رہ چکا ہے۔ تبلیغی دور کے تقاضے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے زمانہ میں پورے کر دیے بلکہ دین کا نفاذ بھی آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود مکمل طور پر چھوڑ گئے تھے۔ خلفائے راشدین نے اسی کو نافذ

کیا اور اس کے غلبے کی حفاظت فرمائی۔ ماشاء اللہ ہم سب مسلمان ہیں۔ ہمیں از سرِ نو تبلیغ صالح کی تنظیم اور نفاذِ دین کی ضرورت ہے، تاکہ دین کا غلبہ جو تفریق کا شکار ہوا ہے از سرِ نو قائم ہو سکے۔ انشاء اللہ حکومتِ پاکستان اور عالمِ اسلام اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت کام سے ضرور اور جلد عہدہ برآ ہونے کی بھرپور کوشش کریں گے۔

مذکورہ بالا تصنیف اپنی جامعیت، افادیت اور تاثیر و تاثر کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قابلِ عظمت کتاب کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور دُنیا کی دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو تاکہ قرآنِ مقدس کی عظمت اور اسلام کی حقانیت ان لوگوں کے ذہن نشین ہو سکے جو مختصر وقت میں قرآنِ حکیم و فرقانِ مجید سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

دِلی دُعا ہے کہ ربِّ کعبہ مُرشدِ کامل کے فیض کو اور خُداداد مملکتِ پاکستان اور عالمِ اِسلام کو ابدالآباد تک قائم رکھے تاکہ دُنیائے اِسلام داخلی اور خارجی مُہلکات سے محفوظ رہے اور اعدائے اِسلام کسی رُوحانی یا جُغرافیائی سازش میں کامیاب نہ ہوسکیں اور ہم قرآن مجید کی برکات کے وسیلہ سے دینِ حق کی روشنی میں نہ صرف اپنی پاک سرزمین بلکہ عالمِ اسلام اور حجازِ مقدس کی سرزمین کی خدمت کر سکیں جس پر اعدائے اسلام کی ناپاک نظریں اُٹھ رہی ہیں۔

خاکسار

خلیفہ رانا عبدالحمید احمد عفی عنہٗ

قرآن مجید اور کوشش

قرآن مجید نے عالمِ اسباب سے روگردانی کو کفرانِ نعمت قرار دیا۔ یہی تبلیغ قرآن مجید تھی جس نے صورتِ اسلام کیساتھ رہبانیت کی ہمیشہ کے لیے بیخ کنی کی اور ایسے فقر و غنا کی بنیاد ڈالی جس نے ماسوائے اللہ کی پرستش سے ہٹ کر صرف اللہ کے لیے اپنے آپ کو مختص کیا اور لومتہ لائم سے الگ ہو کر ہمہ گیر میدان میں کود پڑے۔ کہیں وہ فقر و غنا حیدرِ کرارؓ کی صورت میں اور کہیں خلفائے راشدینؓ کی صورت میں اور کہیں خالد بن ولیدؓ کی صورت میں کہیں عساکرِ اسلام کی صورت میں کائنات کے میدانِ عمل میں پیہم گامزن نظر آتا ہے۔

علیم اختر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خوش بختی سے آج سرزمین پاکستان میں اس قرآن مجید کا ۱۴۰۰ سو سالہ جشنِ نزولِ پاک منایا جا رہا ہے جو اس خدائے علیم و بصیر کا کلام ہے جو مختارِ کُل ہے۔ جس کے قبضۂ قدرت میں سارے جہانوں کی بادشاہی ہے۔ جس نے ہمیشہ انسانیت کو اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے راہِ راست پر چلنے کی دعوت دی۔ دعوتِ حق کو سمجھنے کے لیے عقل و دل اور نگاہ جیسی ہمہ گیر صلاحیتوں سے نوازا اور فطری ہدایتوں کی روشنی میں انہیں میدانِ زیست میں تجسس کے مواقع دیتا رہا۔

ہم خدائے ذوالجلال و برتر کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کے کلامِ مقدس کا جشن منا رہے ہیں جو ۱۴۰۰ سو سال قبل اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ختمی مرتبت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سرزمینِ عرب میں نازل ہوا تھا۔ جس کی سعادتیں اور برکتیں تواتر سے مسلمانانِ عالم کے ساتھ شامل رہیں اور انہیں مشکل ادوار میں فتح و ظفرمندی اور اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ گزارتی رہیں۔

مسلمانانِ عالم کے ان صالحانہ کارناموں کی شہادت تاریخِ اسلام کی صورت میں موجود ہے۔ قرآن مجید اپنے ازلی اور ابدی تسلسل کے ساتھ اپنے پیروکاروں کے ذریعے انسانیت کی رہنمائی کرتا ہُوا دورِ جدید کی رہنمائی کے لیے بھی من وعن ملتِ اسلامیہ کے پاس موجود ہے۔ اپنے سچے وعدوں کے مطابق ابدالآباد تک غیر متبدل ہے اور ہمیشہ انسانیت کی

رہنمائی کرتا رہے گا۔ قرآن مجید کا یہ وعدہ کہ :۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ؕ

بکمال پورا ہوتا ہے اور اس کے لافانی ہونے کی دلیل اس کا اعجاز انگیز نزول اور تواتر ہے۔

اس کے مقابلے میں دوسری مذہبی کتابیں ترمیم کا شکار ہو چکی ہیں۔ وہ اگرچہ سچی اور من جانب اللہ تھیں مگر وہ جزوی آئین تھیں اور حالاتِ زمانہ نے انسانی مجلس کو مجبور کیا کہ وہ تکمیل آئین کے لیے کسی نئے ضابطۂ حیات کی تلاش کرے۔ چونکہ پہلی کتب مکمل ضابطۂ حیات نہ ہونے کی بناء پر انسانی طبائع کو مطمئن نہ کر سکی تھیں۔ اس لیے خدائے علیم و بصیر نے اپنے ان وعدوں کو جو پہلے لوگوں سے کیے تھے۔ اس کتابِ موعود کے ساتھ پورا فرمایا اور جس بندے کے ذریعے اس کتابِ موعود کو دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ چنانچہ ختمی بعثت کے ساتھ ہی اپنے وعدۂ عظیم کو پورا فرمایا۔

آفرینش آدم سے لے کر آج تک جبلتہً انسانی مجلس اطمینان کامل کی تلاش میں گرداں رہی اور مطمئن ہونے کے لیے نظامِ تخلیق، نظامِ موت، نظامِ کائنات پر مسلسل غور و خوض کرتی رہی۔ اس فطری غور و خوض میں امکانِ عقلی کے ساتھ اس نے اپنے لیے راہیں متعین کیں مگر کامل آئین نہ ملنے کی بناء پر دوسری آنے والی مجلس نے ان تعینات کو نامکمل قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔

یہ استرداد من حیث المجلس الانسانیہ نزولِ فرقانِ حمید تک جاری و ساری رہا۔ انسانیت کا مطالبہ آئینِ فطرت کو بکمال دیکھنے کے لیے استدلالِ قاطع چاہتا تھا اور فکرِ انسانی نے ہمیشہ استدلال کے سامنے ہتھیار ڈالے ہیں۔ ہر دلیل فکرِ انسانیہ کے سامنے ہار جاتی ہے۔

انسانی فطرت کا یہ خاصا رہا ہے کہ وہ دلیل و برہان کو ایک ہی میدان میں دیکھنے کی طلب گار رہی ہے۔ چنانچہ پروردگارِ عالم کی ہمیشہ یہ سنّت رہی ہے کہ اس نے مزاجِ انسان کے مطابق اس کے رُوح و جسم دونوں کو ان دلائل کے ساتھ دعوت دی جن کے لیے برہان بالاعجاز اور بالخلق موجود تھے۔

قرآن مجید کے مخاطبِ اوّل سرورِ کائنات، فخرِ موجوداتؐ کی ذات ستودہ صفات ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہونے کی حیثیت سے سب سے اوّل انسانوں کے لیے توحید کا تعیّن کرتا ہے۔ تاکہ فکر و عملِ انسانیہ کو ایک لازوال مرکز سے وابستہ ہو کر اتحادِ عمل کے ساتھ ایک مقصد کی جانب چلنے کا موقع مل سکے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ

نزول کے اعتبار سے قرآن مجید کی یہ سب سے پہلی آیت ہے جس نے اپنے مخاطب کو اپنے رب کے نام سے تلاوت کرنے کا حکم فرمایا اور خدا کے آخری بندےؐ کی زبانِ اقدس سے خدائے برتر و اعلیٰ کی وحدانیت کا اقرار اس کی صفتِ خالقیہ کی دلیل سے کرایا اور مخلوق کے لفظ کو خلق کے ساتھ تعبیر فرما کر مدلول کی حیثیت دی۔ اس لیے انسانی نظروں کے سامنے مخلوقات ایک صورت ہونے کی وجہ سے برہانِ ربّانی ہے۔

قرآن مجید اپنے جملہ احکام کے ساتھ اشارتاً کنایتاً، حقیقتاً، مجازاً استدلال اور براہین کے ساتھ انسانیت کے لیے نظریۂ توحید کا تعیّن کرتا ہے اور اس نظریہ کی امانت و حفاظت کے ساتھ عالمِ اسباب میں جسم و جان اور کائنات کو سمجھنے کے لیے اور مقصودِ مطلق کی طرف چلنے کے لیے نظریۂ بعثتِ نبوّت کو من جانب اللہ اعتباری حیثیت سے اس کے وحی و الہام کے ساتھ رشد و ہدایت کی بنائیں ڈالتا ہے۔ تاکہ انسانیت

خدائے لم یزل کی گوناگوں کرشمہ سازیوں کے ساتھ اعتبارِ نبوّت کی کرشمہ سازیوں پر بھی ایمان رکھتے ہوئے رشد وہدایت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

قرآنِ مجید نے نظریۂ توحید پوری انسانیت کے لیے پیش کیا اور اس کی رہنمائی کے لیے نظریۂ ختمِ نبوّت کو اس واسطے پیش کیا کہ اتحادِ عالمِ انسانیت انجام کار ایک ہی رہبرِ اعظم کے ذریعے ایک ضابطۂ حیات سے وابستہ ہو کر ایک ہی خدائے لم یزل کی حکومت کا محکوم ہو کر امنِ عالم کا پرچار کرتے ہوئے ارضی فساد کو دُور کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

قرآن مجید نے نظریۂ آخرت پیش کر کے نوعِ انسانیت پر احسانِ عظیم فرمایا۔ اس واسطے کہ تعیّنِ آخرت کے انسانی ذہنی مقدّمات اور انسانی باہمی مقدّمات کا فیصلہ سوائے نظریۂ آخرت کے کسی طور بھی ممکن نہیں۔ قرآن مجید، نبوّت، یومِ آخرت اور آئینِ فطرت کے ساتھ نظریۂ توحید کو مکمّل کرنے کے لیے حتمی اعمال کی تجویز پیش کرتا ہے۔ قرآن مجید کے مجوّزہ اعمال اس قدر ہمہ گیر ہیں اور اس قدر منصفانہ ہیں کہ رُوح اور مادّہ دونوں کو اعتدال کی ضمنی صُورت دینے کے بعد تجسّس کا حکم دیتے ہیں۔

قرآن مجید کی جُملہ تعلیمات پر غور و خوض کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو اعمالِ صالح کے ساتھ ایسا متمدّن اور مہذّب دیکھنا چاہتا ہے کہ جس سے وہ دونوں جہاں کی سعادت مندیوں سے بہرہ ور ہو سکیں اور اس کی مجموعی حیثیت کا ماحصل مُسلمان کو اخلاقِ حسنہ کے ساتھ انسانی برادری کو ہمنوا کرتے ہوئے ہمہ گیر دیکھنا ہے اور وہ اپنے پیروکاروں کو ہر شعبۂ زندگانی پر محیط دیکھنا چاہتا ہے اور دعوتِ حق کے میدانوں میں اسے صفِ اوّل دیتا ہے اور امامتِ کُبریٰ کے ساتھ

جن صفات کی ضرورت ہو سکتی تھی وہ سب کے سب اس کے لیے مہیا کرتا ہے۔ وہ اس ہمہ گیری کی بناء پر اپنے پیروکار فرد کے لیے

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ط

دعوتِ اطاعت دیتا ہے۔ یعنی جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی۔ وہی حصولِ مقاصد میں فائز المرام ہوا۔ پھر اپنے پیروکاروں کی اجتماعی حیثیات کی بنیادیں۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ط

کے امر سے ڈالتا ہے کہ اے ایمان والو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول مقبول علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی اور اپنے امیر کی اطاعت کرو۔

قُرآن مجید قانونِ فطرت ہونے کی حیثیت سے حاکم مطلق کا منصب خدائے لم یزل کے لیے واضح کرتا ہے اور خدا کی نیابت کے لیے انبیاء کو تجویز کرتا ہے اور تاریخ نیابت پر تبصرہ کرتے ہوئے ابو البشر حضرت آدم علیہ السّلام کو بہ اعتبارِ نبوّت نیابتِ اوّل دیتا ہے اور یہ نیابت تدریجاً ''ایک لاکھ کئی ہزار انبیاء پر تقسیم ہوئی۔

انسانی مزاج کے مطابق ایک ختمی نیابت کے ذریعے ختمی آئین کو انسانیت کے پاس پہنچانا مقصُودِ قدرت تھا۔ چنانچہ اس آئین کا ایسا ہونا کہ وہ صُورتِ ازل، صُورتِ ابد، صُورتِ رُوح، صورتِ انسانیہ، صُورتِ کائنات، صورتِ معانی، صورتِ حقائق اور صُورتِ حقیقتِ حقہ کا تعیّن کرتے ہوئے ایسا نصابِ تعلیم دسترخوانِ انسانیت پر پیش کر سکے کہ انسان ان خطوط پر چل کر شعبۂ زندگی پر تصرّف حاصل کرتا ہوا نیابتِ کبریٰ کا مکمل ثبوت پیش کرے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ط

کی نیابت علمی سے لے کر فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلقِ عظیم تک اور بعثتِ نبوّت سے لے کر وصالِ مبارک تک نیابتِ کبریٰ کا ہی علماً و عملاً ترجمہ ہوتا رہا۔

اس اجمالی تمہید کا منشا مسلمانانِ عالم کے طبائع کو قرآن مجید کی اس مجموعی دعوت کی طرف مائل کر کے ان خطوط پر چلانا مقصود ہے جن کی تجویز قرآن مجید پیش کرتا ہے۔ قرآن مجید کا ہمہ گیر نظریۂ حیات

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً

کے امر سے اسلام کے جزوی اور کلی احکام کی تعمیل کے ساتھ اجتماعی طور پر مسلمانوں کو ہمہ گیری عمل کے ساتھ خوشنودیٔ رب حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات کی افادی صورتیں دو ہیں۔ ایک اس کی تلاوت یعنی سمجھ کر پڑھنے کا ثواب۔ دوسرے اس کی تعلیمات سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہونے سے دنیا میں کلیتًہ آسودگی کے ذرائع کا میسّر آنا ہے گویا قرآن مجید اپنے پیروکاروں کے فلاحِ دارین کا ضامن ہے۔

عقائدِ اسلامیہ کے بعد اسلامی اعمال کی تشکیل۔ تاریخ عمل اسلامیہ پر مرتب ہوتی ہے قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے فطرت کی ان سبیلوں پر نظر رکھنا ضروری ہے جو انسان کی بہبود کے لیے بنائی گئی ہیں اور وہ انسانی زندگی کا قدرتی سامان ہیں۔ جن کا حصول اس کے لیے ضروری ہے جو چیزیں جسم و جانِ انسانیہ اور اس کی اجتماعی زندگی کے لوازم ضروریہ میں داخل ہیں جن سے انسانی معاشرہ الگ نہیں ہو سکتا اور وہ اسباب انسان کے لیے لوازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن مجید کی تعلیمات کو آیات کے نام سے موسوم کر کے ان کا مطالعہ کرنے کی اس واسطے دعوت دیتا ہے تاکہ انسان گوشۂ عالم کے معنی خیز آیات کی عملاً و علماً تشریح کر کے

ان کو اپنے تصرّف میں لاکر ان کے منافعوں سے بہرہ وَر ہو سکے۔ قرآن مجید کائنات کے سرسری مطالعہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ ہر اس طور و طریقہ سے مطالعۂ کائنات کی اجازت دیتا ہے جس سے حقیقتِ کائنات کے مخفی گوشے انسانیت پر واضح ہو کر انسان کو مزید معلومات کی دعوت دیں۔ یہ مطالعہ ژرف نگاہی سے علمِ قرآن کے ساتھ تشریحِ کائنات چاہتا ہے۔ آیاتِ مذکورہ میں خدا کی بڑائی اس کی ان مہربانیوں کے ساتھ ظاہر کی گئی ہے جو نظامِ کائنات میں انسانیت کے لیے خدا کے حکم سے بروئے کار ہیں۔

اس صفحۂ ہستی پر ان کا بروئے کار ہونا سراسر انسانی منفعت کے لیے ہے اور انسان ان سے اسی حالت میں استفادہ کر سکتا ہے جب وہ سنجیدگیٔ عقل کے ساتھ اور صحت مندانہ فکر کے ساتھ ان کا مطالعہ کرے۔ مطالعۂ کائنات نہ کرنے کی حالت میں انسانی معاشرہ اصول کی راہوں سے غافل ہو کر مساہلہ پسند ہو جاتا ہے۔

مساہلہ انسانی معاشرے کے اس تساہل و تکاسل کا نام ہے جو عمل سے جان چرا کر، مشقت سے دل برداشتہ ہو کر تن آسانی کی راہیں تلاش کرے۔ یہی مساہلہ کچھ مدت کے بعد علوم و فنون کی ان اصطلاحات میں تاویلات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جو انسانی زندگی کے لیے ارتقائی حیثیات کی ضامن ہوتی ہیں۔ جب یہ مساہلہ علمأ و مفکرین قوم کے اذہان پر مسلط ہو جاتا ہے تو ہر اس علمی اصطلاح میں تبدل و تغیر رونما ہونا شروع ہو جاتا ہے جو انسانوں کو محنتِ شاقہ کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف دعوت دینے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔

یہی حال اسلام سے پہلی اُمتوں کے ساتھ ہوا۔ ان کے مساہلہ پسند علماء و محققین نے اپنی تن آسانی کے لیے ان متعینہ اصطلاحات میں ترامیم کرنی شروع کر دیں جن پر علوم و فنونِ اسلامیہ

کی تعمیر ہو سکتی تھی۔ اور کائنات کے وہ عوامل جو کائنات کے لیے انسان پر محنتِ شاقہ سے لازم آتے تھے ان کو عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے کہیں رہبانیت، کہیں کاہنیت کی صورت میں ترک دنیا کے ساتھ ایسے توہمات کی بنائیں ڈالیں۔ جن کی سرے سے کوئی اصل بنیاد نہ تھی۔

قوم کو بجائے عمل صالح کے اوہام پرست بنا دیا۔ اس قسم کی بے بنیاد دلچسپیوں نے پہلی قوموں کو کائنات کے ضروری اعمال سے بیگانہ کر کے مفلوج العقل، مفلوج الفکر اور مفلوج العمل بنا کر اہل محنت سے الگ کر دیا۔ قرآن مجید نے اپنے نزول کے ساتھ اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے صالح الفکری کے ساتھ صالح العمل ہونے کی دعوت دے کر فلاح دارین کی صرف اہل عمل کو ہی بشارت سنائی اور فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ

نیک عمل کرنے والے ایمانداروں کو خلافتِ ارضی کی بشارت دی اور دوسرے مقامات پر بے عمل جد و جہدِ انسانیہ سے محروم لوگوں کو دنیا و عقبیٰ کی المناکیوں کی تنذیر فرمائی۔

قرآن مجید میں جہاں جہاں عقائد کے ساتھ عقیدۂ توحید کی تعلیم دی گئی وہاں اس کائنات کو اور اس کی اشیاء کو نعمتِ خداوندی کے ساتھ شکریہ ادا کرنے کی تعلیم دی گئی۔ جن انعامات کا شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے وہ سب کے سب عالمِ اسباب سے متعلق ہیں۔ خدا نعمت نہیں بلکہ خدا منعم ہے۔

اور زبانِ قرآن میں انعاماتِ خداوندی کو علومِ سماویہ، بعثتِ انبیاء، نیک اعمال کائنات کو تعبیر فرمایا۔ سورۃ الرحمٰن ساری کی ساری کائنات کے مختلف گوشوں کی ترجمانی کرتے ہوئے دعوتِ عقیدۂ توحید دیتی ہوئی تکذیبِ احکامِ خداوندی اور تکذیبِ بعثتِ انبیاء اور تکذیب

اعمالِ صالح اور تعینات اعمالِ صالح کی تکذیب سے ممانعت کرتی ہے۔ اس واسطے قرآن مجید کی نظر میں گوشۂ عالم پوری انسانیت کے لیے دسترخوانِ نعمت ہے اور یہ وہ خوانِ نعما ہے جس پر انبیاء و اولیاء، صدیقین و شہداء و صالحین اکابر بنی آدمؑ نے نشست فرمائی اور گوناگوں نعمتوں سے استفادہ کیا۔

قرآن مجید نے عالمِ اسباب سے رُوگردانی کو کفرانِ نعمت قرار دیا۔ یہی تبلیغ قرآن مجید تھی جس نے صورتِ اسلام کے ساتھ رہبانیت کی ہمیشہ کے لیے بیخ کنی کی اور ایسے فقر و غنا کی بنیاد ڈالی جس نے ماسوائے اللہ کی پرستش سے ہٹ کر صرف اللہ کے لیے اپنے آپ کو مختص کیا اور لومۃ لائم سے الگ ہو کر ہمہ گیر میدان میں کُود پڑے۔ کہیں وہ فقر و غنا حیدر کرارؓ کی صُورت میں اور کہیں خلفائے راشدینؓ کی صُورت میں اور کہیں خالد بن ولیدؓ کی صورت میں کہیں عساکرِ اسلام کی صُورت میں کائنات کے میدانِ عمل میں پیہم گامزن نظر آتا ہے۔

اسلام کا یہ نظریہ ہے :

الدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ

کہ دُنیا آخرت کی زراعت ہے اور اگر مسلمان اعمالِ صالح سے دُنیا میں حسین ترین تہذیب و تمدّن کی بنا نہیں ڈال سکتے تو وہ راحتِ عقبیٰ کی سعادتوں سے بھی بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔

قرآن مجید کی تعلیم محنت و اجتہاد کے ساتھ اپنے پیروکاروں کو مزید معلومات حاصل کر کے فلاح و نجات اور آسائش سے ہمکنار کرنا چاہتی ہے چنانچہ

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

کی تعلیم اس مجموعی حیثیت عملیہ کی ترجمان ہے اور ان لوگوں کی سعیِ بلیغ پر روشنی ڈالتی ہے جو لوگ اللہ کے راستے میں اجتہاد کرتے ہیں اور اپنی امکانی صلاحیتوں کے ساتھ اللہ کی راہ پر کوشش پیہم

کے ساتھ اللہ کی خوشنودی سے گوناگوں ہدایات کے انعامات پاتے ہیں اور مزید جستجو کے لیے معلومات کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ اس آیت میں ایسے بلیغ العمل اور بلیغ کوششوں سے بلیغ تجسس کرنے والوں کو محسنین کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور ان کی معیّت بالتخصیص اللہ کے ساتھ ثابت کی کہ بالیقین اللہ ایسے محنت کوش لوگوں کے ساتھ ہے۔

آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔ یعنی جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں۔ ہم اُن پر گوناگوں ہدایات کی راہیں کھولتے ہیں اور بے شک اللہ محسنین کیساتھ ہے۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فرما کر اہلِ کوشش کی تخصیص فرمائی۔ فِينَا فرما کر اپنے دین کے راستوں پر چلنے کی تخصیص فرمائی۔ لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا فرما کر دینی کوششوں کے ساتھ حصُولِ معلومات کی فراوانی کی تخصیص فرمائی۔ اور وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ فرما کر سعیٔ پیہم، کوششِ بلیغ اور دینِ اللہ پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ معلومات کی معیّت میں نتیجہ کے طور پر معیّتِ ربّانی کی بشارت دی جو خوشنودیٔ رَبّ کا نتیجہ ہے۔

قُرآنِ مجید کی تعلیمات نتیجۂ عملِ پیہم کے ساتھ خوشنودیٔ ربّ چاہتی ہیں۔ قرآنِ مجید کی تعلیمات عملی میدان میں غیر موحدین کے اعمالِ دنیا پر خوشنودیٔ رَبّ کے ساتھ سبقت لے جاتی ہیں۔ قرآن مجید اپنے پیروکاروں کو دُنیا و عقبیٰ کے لیے نیک اعمال کے ساتھ نیک معلومات کے حصُول کی تعلیم اس واسطے دیتا ہے تاکہ وہ دُنیا و عقبیٰ کے انجام میں پوری آسودگی کے ساتھ خوش حال ہو کر عقبےٰ کے میدان میں حیاتِ جاوداں کی دائمی خوشیاں پا سکیں اور اس خوشی کا تعلق خوشنودیٔ خداوندِ ذُوالجلال کے ساتھ اِس واسطے قائم کیا کہ اللہ ہی نظامِ تخلیق، نظامِ کائنات، نظامِ موت اور نظامِ قیامت کا مالک ہے۔ اور قرآن مجید کا یہ تصوّرِ توحید اور تصوّرِ جزا و سزا ایک ایسا بلیغ تصوّر ہے جو عقل و دل و نگاہ کو ایک ایسے

فطری ضابطے کے ساتھ مضبوط کر دیتا ہے جسے عالم خارج کے حوادث متزلزل نہیں کر سکتے۔ اور رُوح کو اس تصور سے اس قدر استحکام ملتا ہے جس سے جسم خاکی کے جملہ اجزا ایک ہی مقصد کی طرف متحرک ہو کر متوجہ ہو جاتے ہیں۔

رُوح و جسم کے ارتباطِ خیالی سے نظریۂ توحید کو جسمِ انسانی پر مکمل حکومت مل جاتی ہے۔ جسم و جانِ انسانی پر نظریۂ دین و دُنیا سے جو نظریہ بھی غالب آجائے اسی کی حکومت ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں جسم کی عادت ہے کہ مغلوب الخیال ہو کر اسی نظریہ کا محکوم ہونا پسند کرتا ہے جس نے اس پر بکمال غلبہ حاصل کر لیا ہو۔

قرآن مجید کی تعلیم، اصُولِ فطرت پر اس قسم کی تعلیم دینا جس کی بنا رسچائیوں پر ہو، ایک معجزانہ حیثیت ہے وہ جسمِ خاکی کو کسی ایسی تحریص کے ساتھ آمادۂ عمل نہیں کرتا جس میں غیر فطری کذب کا شائبہ تک بھی موجود ہو۔ قرآن مجید کا مقصد تعلیمِ اعمالِ انسانیہ کو سچائیوں پر استوار کرنا ہے تاکہ وہ خیالِ اُولی سے لے کر انتہائے کمال تک سچائیوں کا ہی مظاہرہ کر سکے۔ ان تعلیمات سے میدانِ عمل میں قرآن مجید کے پیروکاروں کو حُسنِ باطن اور طمانیت کلیہ ملتی ہے۔ وہ اپنی زندگی اور موت دونوں کو اللہ کی راہ میں وقف کر کے معراجِ ایمان پاتا ہے۔ اپنی تمام کوششوں کو اللہ ہی کے لیے بروئے کار لاتا ہے۔ وہ اپنے پیکرِ خاکی کے ساتھ ہمہ تن مصروفِ رضائے حق ہو جاتا ہے۔

یہ وہ بنیادی نکتہ ایمان ہے جس سے وہ اپنی نیک نیتی سے رُوح کے جہانوں سے اُٹھتا ہوا اپنے احساسات و افکار و تخیلات کے عساکر کو ہمراہ لیتا ہوا کامیاب سعیٔ عمل کے میدانوں سے گزرتا ہوا، موت کی آنکھ میں اپنی جاہدانہ آنکھ ڈالتا ہوا والہانہ انداز میں مطلوبِ حقیقی سے واصل ہوتا ہے۔

جب کوشش ایمان کی اس نہج کیساتھ آگے بڑھے، تو گوشۂ فطرت کی وہ کون سی چیز ہے۔ جو اس کا ساتھ نہ دے۔ اس آیت میں اہلِ ایمان کی اس کوشش کو راہِ راست پر محمول کیا گیا ہے جو بر سبیلِ اسلام چل کر ان سُبل کو پالے جو انسانیت کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے ہیں تمیزِ حق و باطل کے لیے بھی ضروری تھا کہ انسانیت ایسے آئین کے ساتھ کارگاہِ حیات میں اپنے لیے ایسے اعمال کا تعین کرے جو انانیتِ نفسانیہ سے بچاتی ہوئی انسانیت کے ساتھ حُسنِ مروّت کا سلوک کر سکے۔

عقیدۂ توحید سے ہٹ کر اور عقیدۂ رسالت سے ہٹ کر، عقیدۂ یومِ آخرت سے ہٹ کر کوئی طبیعتِ انسانیہ انانیت سے بچ نہیں سکتی۔ ایسی حالتِ انانیہ میں معلوماتِ انسانیہ بھی جارحانہ اطوار سے نجات نہیں پا سکتے۔ اسلام ایسے ذات و صفات اور معلومات سے اس لیے منع کرتا ہے کہ کہیں انسان اپنی ہیبت انگیز معلومات کے ساتھ انسانیت کے لیے ہلاکت آفرین نہ بن جائے۔

وہ سرے سے ہی اپنے پیروکار کو ایسے نظریاتِ ایمانی پر استوار کرتا ہے جن کی ضربِ اوّل سے انسانی انانیت کے غرور کو پاش پاش کر دیتا ہے تاکہ پیروکارِ اسلام قرآنی نظریات کے تابع اپنی ایمانی، انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر میدانِ کوشش میں علومِ اسلامیہ کے ساتھ فنونِ تامہ حاصل کرنے کے لیے ہدایت کے لاتعداد گوشوں کو راہِ راست پر چلنے کے لیے واضح کر سکے اور خوفِ الٰہی سے اپنے حاصل شدہ متاعِ زندگی کو خوشنودیٔ رب کی راہ میں نوعِ انسانی کی فلاح کے لیے وقف کر سکے۔

اگر وہ اپنی معلومات کے ساتھ غلبۂ حق کے لیے عدل و انصاف کو بروئے کار نہ لا سکے تو قرآنی فیصلوں کے مطابق اس کے سارے اعمال برباد ہو جاتے ہیں اور وہ

بندۂ خدا نہیں رہتا، بلکہ بندۂ دنیا بن جاتا ہے اور اس کی ساری صلاحیتیں عنداللہ حابِط ہو جاتی ہیں۔ اور فرمایا کہ جو لوگ نہجِ ایمانی سے ہٹ کر نفس کے سہاروں پر دُنیا چاہتے ہیں ہم اُن کو دُنیا دے دیتے ہیں مگر انجام کار ان لوگوں کے لیے سوائے عذاب کے کچھ نہیں۔ یعنی دُنیا میں وہ غیر مطمئن ہو کر انجام کی سعادتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ قرآن مجید ان کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ○ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ط

یعنی جو لوگ صرف زندگانیٔ دُنیا کی عیش کے لیے اور اس کی زیب و زینت کے لیے حاصل کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ہم ان کو ان کے اعمال کا بدلہ اسی دُنیا میں دے دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے انجام کار سوائے عذاب کے کچھ بھی نہیں اور جو کچھ انہوں نے دُنیا میں کیا وہ سب کا سب باطل ہو گیا۔

ان دو آیات میں محض دُنیا کی زیب و زینت کے لیے محض اس کی عیش و طرب کے لیے (جو ایک فانی حیثیت رکھتی ہے) کے حصول کی سخت ممانعت فرمائی گئی ہے، چونکہ ایسا حصولِ دُنیا خوفِ ربّانی سے خالی ہونے کی حیثیت سے دوسرے لوگوں کے لیے قطعاً جارح ہو جاتا ہے۔ مگر قرآنی تعلیمات نے اس کے بدل میں حصولِ دُنیا کی تعلیم خوفِ ربّانی کے ساتھ دی ہے۔ اور خوفِ جزا و سزا کے بعد اہلِ ایمان کو دُنیا و آخرت کے حصول کی تعلیم دی ہے۔

اسلام اور ریاستِ اسلام دونوں کو نور و تمثالِ کائنات کی حیثیت دیتا ہے، تاکہ نورانیّت اسلام کی روشنی میں حصولِ کائنات کے ساتھ غلبۂ حق کا اظہار کر سکے۔ مظلوم کے

ظلم کا بدلہ لینے کے لیے غلبۂ حق کو استعمال کرے۔ اور ظالم کو قرار واقعی سزا دے کر ظلم و عُدوان کے دروازے بند کرے۔

صُورتِ انصاف اگرچہ سخت ہوتی ہے، مگر اس میں جارحیّت نہیں ہوتی، بلکہ اہل حق کی حق رسی کا ذریعہ غلبۂ حق کو قرار دے کر عدل کیا جاتا ہے اور میدانِ دفاع میں سالمیت اسلام اور سالمیتِ ریاست کے لیے متاعِ زندگانی کو بروئے کار لانے کا حکم دیا جاتا ہے جس میں اہلِ اسلام کو پہل کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔ غلبۂ حق کو، جامعیّتِ اسلام کو برقرار رکھنے کے لیے دفاع کی صورت میں استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اسلام کی کوشش پیہم کی تلقین سے حصُولِ کائنات اور تسخیرِ کائنات کا بھی سُراغ ملتا ہے۔

دِین وُہ نُور ہے جو عقیدت کے ساتھ عالمِ اسباب کو ہمراہ لے کر راہِ راست پر چلنے میں اپنی نُور افشانی کے ساتھ ممدِ سفر ہو۔ منزلِ زیست پر جس قدر زیادہ سامانِ زیست موجود ہوگا، منزلیں اتنی ہی زیادہ آسان ہوں گی۔

قرآن مجید زمین پر چلتے ہوئے ان ذرّوں کے مطالعہ کی اس طرح دعوت دیتا ہے کہ تم چلتے ہوئے آیاتِ الٰہی کو پامال نہ کرو۔ اور ارض و سماء کی پہنائیوں پر غور کرنے کی تعلیم اس واسطے دیتا ہے تاکہ تم ان کو حاصل کرسکو اور حکومتِ ربّانیہ پر اپنا ایمان مضبوط کرسکو۔ مطالعہ کا مقصُود حصُولِ شئے ہوتا ہے۔ محض مطالعہ کوئی حیثیّت نہیں رکھتا۔ اِس مطالعہ سے مُراد یہ ہے کہ تم اپنی فکری صلاحیتوں کے ساتھ تحقیق و تدقیق کے میدانوں میں کوشش پیہم کے ساتھ آگے بڑھ کر مزید معلومات حاصل کرسکو۔

مُسُبُلَنَا کے معنی بہت سے راہ ہیں۔ اور وہ بُہت سی راہیں دِینی معلومات کے ساتھ تحقیقاتِ کائنات سے بھی متعلق ہیں۔ قرآن مجید کے جُملہ عوامل پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ

میسر آتا ہے کہ مسلمان اس وقت تک اپنی تعلیمات اور اپنی تبلیغ کو مکمل نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ دینی معلومات کے ساتھ ساتھ دنیوی معلومات بھی حاصل نہ کرسکے۔ اور اسباب کے بغیر حالتِ احتیاج میں ایمان کے ضعیف ہونے کا بھی غالب اندیشہ رہتا ہے۔ لہذا قرآنی تعلیمات کی روشنی حصولِ معلومات کے ساتھ احتیاج سے بچنے کی تعلیم دیتی ہے۔

آج مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ دینی تعلیمات کو اپناتے ہوئے، حکمت کے میدانوں میں دستگاہِ کامل حاصل کرتے ہوئے سائنسی علوم حاصل کریں اور دورِ جدید کے نئے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے متحدہ طور پر تیار ہو جائیں کہ منشائے ایزدی یہی ہے کہ اہلِ اسلام عالمِ اسباب سے استفادہ کرتے ہوئے احیائے اسلام کریں۔

دورِ حاضرہ کے جدید تقاضوں نے اذہان پر جو دباؤ ڈال رکھا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ممالکِ اسلامیہ کو اپنی سلامتی کے لیے قرآن مجید کی جملہ تعلیمات کے ساتھ ان احکام کی بجاآوری کے لیے اپنی توجہ کو متحدہ طور پر مرکوز کرنا ہوگا جن کے حصول کی ذمہ داریاں مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے نظریۂ امنِ عالم کو زیرِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس کے لیے ہمہ گیر عقائدِ اسلام کی اس ہیئتِ مجموعیہ میں ترجمانی ضروری ہو جاتی ہے جس سے اذہانِ عالمِ اسلام میں ترقی پسند تغیر پیدا ہو اور وہ انہیں آمادۂ روزگار کرسکے۔

دُنیا میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اعتصامِ بحبل اللہ کے امرِ خداوندی کے ساتھ ذاتی، جنسی، ملکی، رنگ و نسل اور قیودِ وطن کے متعصبانہ اور ہولناک بندھنوں کو توڑ کر ایک خدا، ایک رسول ؐ، ایک قبلہ، ایک نظریۂ آخرت کے ساتھ ایک ہی آئینِ فطرت کے تابع ہو کر اپنی اپنی ریاستوں کی داخلی حیثیات کی حفاظت

کرتے ہوئے اعمالِ صالحہ کے ساتھ خارجی مہلکات سے بچنے کی تدبیر کریں۔

اگر مسلمان صرف اسی نظریہ پر کاربند رہیں کہ وہ متحد ہو کر اپنے استحکامِ ملکی کے ساتھ اپنی ریاستوں کو مضبُوط بنیادوں پر تعمیر کریں اور اپنے پاؤں اپنی ریاستوں سے باہر نہ پھیلائیں، بلکہ اپنے حقوق کی حفاظت کی ذمّے داریوں کو جانتے ہوتے اتحادی نشوونما کے ساتھ آگے بڑھیں تو یقیناً، ہمیں استحکام اور اعتدال کے ساتھ آگے بڑھنے کی راہیں مل سکیں گی۔

غیرِ صحت مندانہ اتحاد، غیر صحت مندانہ تدبیر، غیر صحت مندانہ اجتماع، غیر صحت مندانہ دعوت، غیر صحت مندانہ حصُولِ قوت بجائے استحکام کے اجتماعی زندگی میں تلوّن پیدا کرتا ہے اور داخلی اور خارجی حادثات کے ردّعمل کے بجائے خوفناک ہلاکتوں کو پیدا کر دینے کے مترادف ہوتا ہے۔

اس واسطے مسلمانانِ عالم کو بے معنی جذبات سے بچتے ہوئے سنجیدگی سے سوچنے کو ترجیح دینی چاہیئے اور اپنے حالات کو راہِ راست پر لانے کے لیے عالمِ انسانیّت کے سامنے اعلیٰ ثبوت دینا چاہیئے۔ سرزمینِ پاکستان اتحادِ عالم کے لیے ہمیشہ کوشش کرتی رہی ہے۔ میثاقِ استنبول صحت مندانہ تدبیرِ منزل کا ایک زندہ ثبوت موجُود ہے جو اجتماعی ترقی کی رہنمائی کرتا ہے۔

خداوند تعالیٰ مسلمانانِ عالم کو بر سبیلِ دینِ حق متحد ہو کر پورے وسائل کے ساتھ عالمِ انسانیّت کی ہدایت کے لیے اور عالمِ انسانیّت کی فلاح و بہبُود کے لیے اور امنِ عالم پیدا کرنے کے لیے مواقع عطا کرتا رہے۔

قرآنِ مجید اور مقامِ تفسیر

دورِ جدید کے مدعیانِ قرآن اجتہادِ حکیمانہ سے لاپرواہی برتتے ہوئے حکمتِ سائنس سے بیگانہ ہو گئے۔ جس کو دُنیا کے اہلِ عقل نے اپنی حکمت سے تسخیر کیا۔ یہ حکمتِ سائنس اس مقام پر فائز ہو چکی ہے جس سے انسان پیکرِ خشیت بن چکا ہے۔

قرآن مجید روحانی معراج کے ساتھ ساتھ اپنے پیروکاروں کو مادی معراج بھی دیتا ہے۔

قرآن مجید کی جامعیت مستجمع العلوم والمعانی والحقائق ہے۔

اس کی معنی خیز وسعتوں کا اندازہ کرنا صرف اس حکیم مطلق کی شان ہے جس کا یہ علم و کلام ہے یا وُہی ہستیؐ اس کے صحیح نزُولی مقاصد اور صحیح مقام اور اس کے صحیح ماخذ اور اس کے صحیح مقصُودِ نظر اور وُسعتِ لامتناہی سے باخبر ہونے کی ازلی صلاحیّت رکھتی ہے جس پر قرآن مجید نازل ہُوا۔

نزُول کے خدائی الہامات وحیِ خفی اور وحیِ جلی کی صورت اسی مخاطبِ اولؐ، ختمیؐ مرتبت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر نمودار ہوتے رہے لہذا شانِ نزُول کی جملہ کیفیّات کا مہبطِ اوّل حضوُر علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی ذاتِ اقدس ہے۔ قرآن مجید کے بنیادی استفسار کی نزولی ذمہ داری اللہ اور رسُولؐ کے ذمّہ ہے۔ یہ ذمّہ داری اصولاً ترتیب کے لحاظ سے خدا اور رسُولؐ ہی کا انتخاب کرتی ہے کہ وہ لسانِ قرآن ہی سے ترجمہ کرتے کے بعد لسانِ نبوّت سے اس کے احکامات کا ترجمہ کرتے ہوئے اعمالِ قرآنیہ کی تفسیر کریں۔

تفسیرِ قرآن مجید اہم ترین مضامین سے ایک عظیم علمی حیثیّت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کی اہمیّت پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر بالغ العلم مسلمان کو عقل کے گوشوں پر سیر حاصل نظر ڈالنی پڑتی ہے۔ ایک صحت مند عقل ہی تفسیر کی جانب اپنی صلاحیّتوں کو مبذول کرسکتی ہے اور قابل صلاحیّتوں کے بعد بھی میدانِ تفسیر میں اسے کمالِ تفسیر میں اپنی عاجزی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

تفسیر میں افراط و تفریط دونوں سخت ناجائز ہیں۔ لہذا مفسّر کے لیے گوشۂ عقل کو خوفِ ربّانی سے نہایت احتیاط کے ساتھ صاف کرنا پڑتا ہے۔ اسی احتیاطی صفائی عقل کے ساتھ وہ خدا کی صداقتوں کا ترجمہ کرنے کے لیے آمادۂ کار ہوسکتا ہے ورنہ اسے خِفت و ندامت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کسی چیز کی حیثیاتِ ذاتی کا جائزہ لیا جاسکتا ہے اور کسی چیز کی حیثیات ذاتی کا جائزہ حیثیاتِ عقلی سے باہر ہوتا ہے۔

خداوند ذوالجلال اور اس کے کلام کا احاطہ کرنا عقلِ انسانی سے بالاتر ہے بلکہ اصطلاحِ قرآن مجید میں اس کا احاطہ محال ہے۔ اس فیصلہ کے بعد تفسیرِ قرآن مجید کے بارے میں بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ اِس بحرِ بیکراں میں ہر فاضل، ہر عاقل، ہر دانشور حسبِ استطاعت فکرِ علمیہ کے ساتھ ہی غوّاصی کرسکتا ہے اور اس غوّاصی کے ساتھ لُؤ لُؤ ءِ مکنُون حسبِ قسمت حاصل کر سکتا ہے مگر آنے والے غوّاصِ معانی اس پر تنقید بھی کرسکتے ہیں۔ قرآن مجید نصوص کے اعتبار سے غیر مبدّل ہے، مگر تراجم یا تفسیر کے اعتبار سے سوائے جمہورِ مفسّرین کے جن پر اکثر علمائے امّت نے اتفاق کیا ہو، تنقید ہوسکتی ہے۔

قرآن مجید کی اپنی زبان سے اپنی تفسیر کا معلوم کرنا بغیر تفسیرِ رسولِ مقبول علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے جس کی نہج پر خیر القرون کے شیُوخ القرآن نے تفسیر فرمائی اور مجتہدین، تابعین، تبع تابعین نے اس پر عمل کیا اور ان کے نقشِ قدم پر جمہور مفسّرین نے بعد میں حالات کی نئی شکلوں میں قرآن مجید کی روشنی میں مزید تفسیر کرنے کی ضرورت کو محسُوس کیا۔ اس مزید احساسِ تفسیر نے خیر القرونؓ کے آئمہ مفسّرین کے استدلال کو ایزادِ تفسیر کے لیے اپنا ممد بنایا۔

یہی تعاون بالتفسیر مابعد ادوار میں آئمۃ المتاخرین کے کام آتا رہا۔ تفسیر اپنا تسلسل محققین کے ساتھ جاری رکھتی ہے۔ اور ہر نئے دَور کے تقاضوں کے مطابق جمہُور مفسّرین کے استدلال سے

حالات کا جائزہ لینے کے بعد نئی معلومات کا جواز پیش کرتی ہوئی آنے والی نسلِ انسانیہ کو میدانِ تفسیر میں آگے بڑھنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ یہ تاثراتِ مفسّرانہ تمام تر اللہ کے پاس پہنچ جاتے ہیں جو رضائے ربّانی کی صورت میں رحمت بن کر رحمت مندانہ نہج پر منفکّرینِ نسلِ انسانیہ پر مزید راہیں واضح کرتے ہیں۔

رحمت کے ہبوط و صعود کا سلسلہ عقلِ انسانیہ کے ساتھ بعینہٖ اس طرح وابستہ رہتا ہے جیسے سمندر سے مختلف انداز کے ساتھ پانی زمین پر تقسیم ہوتا ہے۔ کہیں بخارات بن کر اُٹھتا ہے کہیں زمین کے اندرونی خلاؤں سے ہوتا ہوا، کائنات کے رگ و ریشے سے گزرتا ہوا دشت ہائے کائنات و جبالِ کائنات سے چشموں کی صورت میں اُبلتا ہوا، دریاؤں کی صورت میں بہتا ہوا صفحۂ ہستی کو روئیدگی دیتا ہوا پھر واپس اپنے سمندر میں چلا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کلامِ الٰہی کے جملہ تراجم انسانی سعادتوں کو سعادت مندانہ روئیدگیاں دیتے ہوئے اللہ ہی کے پاس چلے جاتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:۔

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ط

یعنی تمام نیک باتیں اور نیک اعمال اللہ ہی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

اس آیت میں کلمۂ طیّب سے وُہ محتاط کلام مراد ہے جو اختراعِ نفسانی اور اختراعِ عقلی سے الگ ہو کر "لوجہ اللہ" کی جائے۔ لِوجہ اللہ کلام کو اتنی وسعت مل سکتی ہے کہ وہ اللہ کی خوشنودی کے ساتھ عالمین کا احاطہ کرلے۔ مخترعاتِ نفسانیہ اور عقلیہ کا دامن اتنا تنگ ہے کہ وہ اپنے ذاتی ظرف کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ چہ جائیکہ وہ خدائے لم یزل کے کلام کا مفسّر ہونے کا دعوٰی کرسکے۔

آئمہ مفسّرین نے خوفِ الٰہی سے تقوٰی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ترتیبِ تفسیر ماضیہ پر

اپنی تفسیری بناؤں کو اُستوار کیا۔ ایک طرف اُنہوں نے علومِ ماضیہ کی سند پیش کر کے اُن کی حفاظت کی تو دُوسری جانب اُن اسناد کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کی صحیح ترجمانی کی جس سے تفسیر کے گوشے مزید وضاحت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ یہ وُہ اصُولِ تفسیر ہے جس کو قرآن کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔ اس اصُول میں قرآن مجید کے لفظی تراجم، تفسیری حیثیت، تشریحی نوعیّت، تفصیلی مقام، توضیحی بلاغت، سب کا اعتبار شاملِ تراجم ہوتا ہے جس سے سچائیوں کے ساتھ سچائی کا ترجمہ سامنے آکر اطمینانِ قلوبِ انسانیہ کا باعث بنتا ہے۔ کسی گوشۂ علم کے نامکمل ہونے سے گوشۂ عمل نامکمل ہو جاتا ہے۔ نصُوصِ قرآن مجید اپنی کاہل تفسیر کے ساتھ بنیادی اعمال کی تفاصیل پر بات کرتے ہیں تاکہ طبائع انسانیہ تعارفِ اعمال میں غلطی سے بچتی ہوئی اصُولِ قرآن کے مطابق عملِ صالح کو جاری رکھ سکیں۔

اس اعتبار اور لحاظ سے علم، حکمت اور عرفان تینوں کی مسلسل ضرورت پیش آتی ہے۔ انسان کا علمِ ذاتی بغیر مجوّزہ علُوم کے جن کو علم العلُوم کہا جاتا ہے۔ بہت مختصر اور محدُود ہے۔ جس پر صرف پیٹ بھرنے کے سوا کوئی دوسرا علم میسر نہیں آسکتا اور یہ صفت، صفتِ حیوانیہ ہے۔ اس صفتِ حیوانیہ سے آگے بڑھ کر صفاتِ انسانیہ کو پانے کے لیے علم العلُوم کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس علم کا حصُول، تفاسیرِ علُوم اور تفاسیرِ اشیا کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جس طرح نمُود و نمُو کے لیے حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔

علم العلُوم کیساتھ ساتھ حکمت العلوم کا ہونا علم کی ارتقائی حیثیت ہے۔ جس علم کے ساتھ انسان حکمت العلیوم کو اخذ کرتا ہوا تشریحاتِ اشیاء کا باب کھولتا ہے۔ اس علم سے علم العلُوم کو اتنی تقویت ملتی ہے کہ وہ منزلِ تحقیق و تشریح میں چراغِ راہ بن جاتا ہے۔ حکمت العلُوم کے ساتھ عرفان العلوم کا ہونا اتنا ہی لازم ہے جتنا کہ چراغ کی روشنی میں کسی چیز کو دیکھ کر اس کا

تعارفِ صوری حاصل کیا جائے۔ بغیر تعارفِ شے کے تحریص و تشریح آگے بڑھ نہیں سکتی۔ یہ علوم اپنے اپنے مقام پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں علم العلوم، حکمت العلوم، عرفان العلوم علوم الحکمت، حکمت الحکمت، عرفان الحکمت، علم العرفان، حکمت العرفان اور عرفان العرفان کے نصابِ تعلیم کے ساتھ ہی کسی شئے کی مکمل تفسیر ہو سکتی ہے۔

ان علوم میں سے ایک علم کی کمی کے ساتھ وہ تفسیر مکمل نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ تفسیر ناقص ہے۔ تکمیلِ تفسیر کے لیے ایک شے کی حقیقتوں تک پہنچنے کے لیے اِن جملہ علوم کا سہارا لینے کے بعد ہی صفاتِ شے کے زینوں کو عبور کر کے حقیقتِ شے کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ حقیقتِ شے کے نہ میسر آنے سے وہ تفسیر تشنۂ تکمیل رہتی ہے۔ دُنیا کی کسی شے کی ترجمانی علومِ مذکور رہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ پھر قرآن مجید کی تفسیر کے لیے ان علوم کے بغیر کیونکر جسارت کی جا سکتی ہے۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہر مفسّر نے اپنی علمی بضاعت کے مطابق تفسیر کے کسی گوشے کی وضاحت کی ہے، مگر ہر تفسیر پر "تفسیرِ مکمّل" کے الفاظ منطبق نہیں کیے جا سکتے۔

قرآن مجید اپنی تفسیر کے ساتھ ابنائے آدم کی تفسیر وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ کے ساتھ کرتا ہوا، اسے تمام خلائق پر برتری دیتا ہوا اسے تشرّف و تکرم کی خلعت پہناتا ہے۔ کیونکہ وہ صاحبِ عقل و ہوش، اور صاحبِ دید و شنید ہے۔ محسوسات کا ادراک کرنے کی اس میں کامل صلاحیّت موجود ہے اور محسوساتِ کائنات کی صورت میں اور اس کے علاوہ تاثرات کی غیر مرئی صورت میں اس کے سامنے اور اس کے انفس و آفاق میں صورتِ تمثال بنا دیے گئے ہیں۔

قرآن مجید، ان تمثال کی انسان کے سامنے اس طرح آئینہ داری کرتا ہے جس طرح سورج گوشۂ کائنات کو روشن کرتا ہے۔ آنکھوں کی آئینہ داری مرہونِ ضیائے مہتاب ہے۔

گوشۂ کائنات روشن ہونے کے بعد وہ آئینہ داری کر سکتی ہیں ۔ ورنہ مطالعۂ کائنات بلا روشنی آفتاب اس پر محال ہو جائے ۔ قرآن مجید اور اس کی تفسیر کا منشا گوشۂ عالم کی ظاہری و باطنی کیفیات پر روشنی ڈال کر بصیرتِ انسانی کی آئینہ داری ہے ۔ لہذا تفسیرِ قرآن کو صرف مفہومِ قرآن کے لیے پیش کرنا اور انسانی فکر کو اس کے مفہوم تک محدود رکھنا ، مزید نعمتِ الٰہی سے فکرِ انسانیہ کو روک دینے کے مترادف ہے ۔ چونکہ قرآن مجید ایک کامل و مکمل نصابِ تعلیم ہے ۔ نصابِ تعلیم کے حصول کے لیے طالب علموں کو اتنا ہی ذہن نشین کرانا کہ تم نے نصابِ تعلیم تک ہی محدود رہنا ہے ۔ اس کا واضح مطلب یہ ہو گا کہ طالب علم مفہومِ نصاب کے لیے کالج کی دیواروں میں بند رہے ۔ حالانکہ طالب علم کا منشا ، دار العلوموں کی دیواروں سے باہر نکل کر معلومات حاصل کرنا ، ہوتا ہے ۔ اگر علم معلومات کے لیے نہ پڑھا جائے تو علم برائے علم کی حیثیت میں محدود ہو جاتا ہے ۔

قرآن مجید نصابِ تعلیم کے اندر محدود ہونے کی تعلیم نہیں دیتا ۔ بلکہ وہ اپنے علومِ ابدیہ کے ساتھ صحیفۂ کائنات کے معلومات حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے ۔ اور اپنے طالب علم کو عالمِ روزگار کے میدانِ تحقیق میں اتنا ارفع اعلیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کوئی مکانی اور زمانی حالات کا جائزہ لے کر ان کو متاعِ زندگانی بناتا ہوا اپنی تفوّق و برتری کا اس نصاب کے ساتھ اظہار کر سکے ۔

اس واسطے مسلمان قوم پر یہ لازمہ عائد ہوتا ہے کہ وہ علومِ فرقانِ حمید کو علم العلوم ، علم الحکمت اور علم العرفان کے ساتھ اس کی تفسیرات کر کے اپنی کم مائیگی کو خدا اور انسانیت کے سامنے مایۂ ناز بنا سکے ورنہ اس کے حسین العمل ہونے کی حیثیت مفقود ہو جاتی ہے ۔ یہ فقدانیت صلاحیتِ فکریہ سے محروم کر دیتی ہے اور یہ محرومی احتیاج کی صورت میں نمودار ہو کر جا بِ غیر

بنا دیتی ہے۔ کوئی چاکر آزادی رائے حاصل نہیں کر سکتا۔ اس واسطے قرآن مجید اپنے پیروکارں کو اپنی صلاحیتوں کے ساتھ آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات صرف اپنے اطاعت گزاروں کو پابندِ آئینِ فطرت ہو کر آزادیٔ فکر کے ساتھ میدانِ کارزار میں عمل پیہم کا سبق دیتی ہیں۔ قرآن مجید کی سب سے بڑی حیثیت اس کا طرزِ تعلیم ہے جو اجزائے رُوح اور اجزائے کائنات دونوں کا بیک وقت ترجمہ کرتا ہے۔ ہر زمانے کے مطابق اپنے ماننے والوں کو علومِ تکوینیہ کیساتھ مطالعۂ آیات کی ترغیب دیتے ہوئے اعتراضِ غیر سے بچاتا ہے۔

اہلِ کائنات نے آفرینش سے آج تک جن چیزوں کو معلوم کیا اور جن معلومات کے لیے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ان سب کا ذکر اس انداز سے کر دیا کہ ان کے حاصل کرنے والا بنائے انسانیت کے ضابطوں کی پابندی کرتے ہوئے ان سب چیزوں کو حاصل کر سکے۔ اگرچہ تفسیرِ اشیاء میں بعض اقوام تعلیماتِ ربانی سے ہٹ کر استفسار کر رہی ہیں تاہم وہ ضابطۂ فرقان سے الگ نہیں ہو سکیں۔ چونکہ انہی فطری اقدار پر عالمِ انسانیت معلومات فراہم کر رہا ہے جن اقدار کی قرآن مجید نے نشان دہی کی۔ قرآن مجید کا طرزِ تبلیغ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا پیروکار جہاں ارکانِ عبادات کے حقوق کی رعایت پر تبصرہ کرتا ہے وہاں ارکانِ تشریحِ کائنات کے حقوق کو بھی ضبطِ عمل میں لاتا ہے۔

آج کی فلک گیر حکمت، ماضی کی بنائے حکمت پر تعمیر ہوئی ہے اور قرآن مجید نے:

وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

فرما کر ایک ذرے سے لے کر ساری کائنات تک کو اپنا مضمون بنا لیا، تاکہ اس کا طالب علم میدانِ تحقیق میں اہلِ دُنیا کے سامنے مایوس ہو کر تحقیقات کے ہتھیار نہ ڈال دے۔ تفسیرِ قرآن مجید کا ماحصل روحانی اور مادی اجزا کی تفسیر ہے۔ انسانی عقل اپنی حکمت سے اجزائے عالم

کا تجزیہ کرنے کے بعد عملی تفسیر کے ساتھ بہت سی نامعلوم چیزوں کو وجود دے چکا ہے اور ایک صورتِ مشہودہ کے ساتھ ان معلومات کو جامۂ تکمیل دے کر شہادتِ عملی کے ساتھ اور شہادتِ فنی کے ساتھ کائنات سے منوا چکا ہے۔ جن سے انکار صداقتِ مشہودہ کا انکار ہے۔ ذرّۂ بے مایہ کو نامعلوم حیثیت میں انسان ذرّۂ بے مقدار کے نام سے یاد کرتے تھے۔ آج انسانی فکر نے اس کو اجزائے تحلیل میں تقسیم کر کے اس کی قیامت خیز حیثیت کو ظاہر کر کے یہ ثابت کر دیا کہ عقلِ انسانی قیامت کی نگاہ رکھتی ہے۔

جس ذرّے کے متعلق بلاتحقیق کہا جاتا تھا کہ وہ ایسا ذرّہ ہے جس کے دو جزو نہیں ہو سکتے۔ تحقیقِ انسانیہ نے اس کو دو ٹکڑے کر کے اس کا توڑنا ثابت کر دیا اور اسی تحقیق نے آفتاب کی ذرّہ نوازی کے وہ تاثرات طشت از بام کر دیے جو ذرّے کے ساتھ ہمیشہ سے متعلق ہو کر نگاہِ انسانیہ سے مستور رہے۔ آج کی حکمتِ سائنسیہ نے یہ ثابت کر دیا کہ ہر ایک ذرّۂ آفتاب و مہتاب کی شعاعوں کو برس ہا برس اپنے سینے میں جذب کرتا رہتا ہے۔ ذرّے کی اس قوتِ جاذبہ نے انسانی نگاہ کو اس طرح مخاطب کر لیا کہ وہ اس کو اپنے متاعِ زندگانی میں اولیت دے سکے۔ اسی قوتِ مسخرہ کا نتیجہ ایٹم کی صورت میں نمودار ہوا اور انسانیت کو اپنی ہیبت ناک طاقت سے لرزہ براندام کر دیا۔

یہ حکمت العلوم کا ایک باب ہے۔ جس کو قرآن مجید نے لازم قرار دیا تھا اور اپنے طالب علموں کو اس نے یہ حق تفویض کیا تھا کہ وہ حکمت العلوم کے ساتھ حکمت الحکمت کا سراغ لگائیں اور علومِ حکمت کو چراغِ راہ بناتے ہوئے عرفانِ شئے حاصل کریں مگر بدقسمتی سے دورِ جدید کے مدعیانِ قرآن اجتہادِ حکیمانہ سے لاپرواہی برتتے ہوئے حکمتِ سائنس سے بیگانہ ہو گئے جس کو دنیا کے اہلِ عقل نے اپنی حکمت سے تسخیر کیا۔ یہ حکمتِ سائنس اس مقام پر فائز ہو چکی ہے جس سے

انسان پیکرِ خشیّت بن چکا ہے ۔ سائنس اپنی اس ہیئت مشہودہ کے ساتھ گویا قیامت کی ترجمان ہے ۔ قرآن حکیم

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰؤُا ط

کے عالمانہ خطوط پر علمائے کرام کے ساتھ "خشیۃ اللہ" کو متعلق کرتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ خشیّت بغیر ہیبت کے واقع نہیں ہوسکتی ۔ خدائے لم یزل کی ہیبت اس کی حیرت انگیز تخلیق کے ساتھ وابستہ ہے ۔ وہ ذاتی طور پر صاحبِ ہیبت ہے مگر وہ سامنے نہیں آتا ۔ نہ کسی آنکھ نے اس کو دیکھا اور نہ کوئی آنکھ اس کی ذات کو دیکھ سکے گی ۔ صرف علمِ یقین کے ساتھ اس کا تعیّن علومِ الٰہیہ کے ساتھ ہوتا ہے ، مگر بُرہانی طور پر نظامِ تخلیق کے مشاہدات سے بر سبیلِ صفات ہی اللہ کی ذات کا بالآیات تعیّن ہوتا ہے اور اہلِ علم لوگوں کے دِلوں پر اس وقت اس کی ہیبت طاری ہوتی ہے جب علُومِ خداوندیہ کے ساتھ وہ اپنی عقلِ انسانیہ کی معیّت میں اس کی مخلوقات کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔ یہ مشاہدہ سرسری مُطالعۂ کائنات کے ساتھ سطحی طور پر واقع ہوتا ہے ، مگر تشریحِ مخلوقات کے ساتھ خشیۃ اللہ بنتا ہے ۔ اس خشیّتِ ربّانی کی زمین مہیّا ہوتی ہے ، مگر تشریحِ کائنات سے خشیت کا حصُول بکمال ہوتا ہے ۔ اگر ایک ذرّے کی تشریح پوُری دُنیا کو ہیبت میں ڈال سکتی ہے تو مزید تشریحاتِ انسانیہ خدا جانے انسانیّت کے لیے کتنی ہیبت کا باعث بنیں گی ۔

اس آیت میں صرف علمائے محققین کو ہی صاحبِ خشیّت قرار دیا گیا ہے ۔ لہذا قرآن مجید کی تفسیر بھی علمائے محققین کے ذمّہ ہے اور تفسیرِ صحیفۂ کائنات بھی علمائے ربّانی ہی کے ذمہ ہے ۔ سائنس عِلمِ کُل نہیں ، مگر جزوِ علم ضرور ہے ۔ نصابِ تعلیم سے جزوِ علم کو جُدا نہیں کیا جاسکتا بلکہ تقسیمِ علوم میں یہ قرآن مجید کا ایک حصّۂ تعلیم ہے جس کو اس کے طالب علموں میں ایک کورس

کی صورت میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تفسیرِ قرآن مجید کے لیے علومِ ارضیہ، علومِ فلکیہ ، علومِ ریاضی، علومِ رُوحانیہ، علومِ مادیّہ، اور معلوماتِ انسانیہ سب کی ضرورت درپیش آتی ہے۔ مسلمانانِ عالم، تفسیرِ قرآن مجید کو عملاً اسی وقت سمجھنے کے قابل ہوں گے، جب وہ اس کی روشنی میں رُوحانی اور مادی تجزیہ کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ قرآن مجید میں تسخیرِ کائنات کا برملا ذکر آیا ہے۔ جس کو کوئی بھی خارج از نصابِ قرآن نہیں کہہ سکتا۔

چنانچہ قرآن مجید کے مختلف مقامات میں تسخیرِ کائنات پر تبصرہ کیا گیا۔ تسخیرِ جبال، تسخیرِ فضا، تسخیرِ اقصائے عالم، تسخیرِ برّ و بحر، تسخیرِ خیل و بغال اور تسخیرِ نباتات و جمادات کا بالتصریح بار بار ذکر آیا ہے اور یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ فرما کر آنے والی جدید تخلیقی تکنیکی سواریوں کو بصورتِ مشین ثابت کر دیا اور فرمایا :-

یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ط

"یعنی اے سب جنّو اور انسانو! تم اگر گوشۂ عالم کے اور آسمانوں کے کناروں سے آگے بڑھنا چاہو، تو نہیں بڑھ سکتے، مگر اللہ کی تائید سے اور قوتِ عملیہ کی دلیل سے آگے بڑھ سکتے ہو۔"

یہاں اس آیت میں اِلَّا بِسُلْطٰنٍ کہہ کر نفیِ عبورِ اقصائے عالمِ ارضی و سماوی کو مستثنیٰ قرار دے کر عبورِ اقصائے عالم کو ثابت کر دیا۔ اگر سلطان کے معنی دلیل کے لیے جائیں، تو دلیل قوتِ عملیہ ثابت ہوتی ہے اور اقصائے عالم کو عبور کرنے کے لیے جن دلائلِ عملیہ کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ وہ یقیناً تکنیکی، رُوحانی یا معجزاتی نظام سے متعلق ہوں گی۔

نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عبورِ اقصائے عالم کے ساتھ آسمانوں کا معراج نصیب ہوا۔ یہ معجزانہ قوتِ عمل بھی اور فرشتوں کا اقصائے عالم کو عبور کرنا رُوحانی قوتِ کرامت ہوتی ہے۔ مگر باقی انسانوں کے لیے صنعتی تکنیکی عمل سے ہو سکتی ہے جس کو آج کے راکٹوں نے قوتِ عقلیہ انسانیہ کے ساتھ عبور کر کے ثابت کر دیا کہ صنعتِ انسانیہ کیمیائی قوتوں کے ساتھ اقصائے عالم کو عبور کر سکتی ہے۔ اس قسم کے اور بہت سے حوالہ جات ہیں۔ جن سے رُوحانی تسخیر کے بعد جو کرامت کی صورت پر مرتب ہوتی ہیں۔

مادّی صورتوں سے بھی تسخیرِ کائنات اور عبورِ کائنات کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے کیونکہ مادّے کی صنعت پر انسان ہی کا تصرّف ہے جو آئے دِن مزید معلومات کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور آگے بڑھ کر ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔

اس مقام کی مناسبت سے اقبالؒ نے کیا خوب ترجمانی فرمائی :۔

تیرا اندیشہ افلاکی نہیں ہے !
تری پرواز لولاکی نہیں ہے !
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تیری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے۔

یعنی تو صاحبِ معراجؐ کا پیروکار تو ہے مگر بلندیٔ افلاک سے بے خبر ہے۔

اگر سُلطان کے معنی تائیدِ خداوندی لیے جائیں تو بھی جملہ معجزاتِ انبیاء، جملہ کراماتِ اولیاءؒ، اور جملہ تخلیقی کراماتِ انسانیہ اُسی کی تائید کا نتیجہ ہیں۔ معجزہ تائیدِ خداوندی سے انبیاءؑ کی قوت بنتا ہے اور جملہ کرامات تائیدِ خداوندی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور جملہ صنعتِ انسانیہ بھی تائیدِ خداوندی ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

اس ضمن میں انسانی کرامات اللہ کا فضل ہوتی ہیں جو افضل کی جانب سے ہوتی ہیں اور فضل کا عروج قدرتی طور پر افضل کی جانب ہوتا ہے۔ اور افضل کی تائید قدرتی طور پر فضل کے لیے ہوتی ہے۔ یہی تدبیرِ خداوندی مفضول میں کارفرما ہے کہ ہر چیز اس کے فضل سے مظہر ہوتی ہے اور اس کی ربوبیّت سے جہاں ہر چیز تدریجاً معراجِ کمال پاتی ہے وہاں عقلِ انسانی بھی اپنے مبادیات سے فضلِ الٰہی کے ساتھ کہیں مرسلینؑ کی صُورت میں معجزات بن کر سامنے آتی ہے اور کہیں اولیأ اللہ کی کرامات کی صورت میں ظہورپذیر ہوتی ہے۔ کہیں صنعتِ انسانیہ کی صُورت میں جلوہ گر ہو کر معراجِ کمال پاتی ہے۔ یہ خُدا کی صفتِ ربُوبیّت کا تصرّف ہے کہ عقولِ انسانیہ مختلف جاموں میں معراجِ کمال پا رہی ہیں۔ اگر عقلِ انسانیہ کے مظاہرات نمُودار نہ ہوتے، تو خُدا کی کائنات کا ترجمہ نامکمّل رہتا۔ ابھی سلسلۂ کائنات جاری ہے اور سلسلۂ ہست و بُود کی اصطلاحات بھی جاری و ساری ہیں۔

اولادِ آدم مزید معلومات کی کیسا پھیلنے پھُولنے کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ اجرامِ فلکی کے تاثرات سمندر میں مدّ و جزر پیدا کرتے ہیں اور رحمِ مادر میں بچّے کی صنف پر متاثر ہوتے ہیں۔ پھل، پھُول ان سے رنگ و ذائقہ حاصل کرتے ہیں۔ زمین کی زندگانیاں ان سے حرارت و برودت پاتی ہیں۔ ارضی اور فلکی نظام حیاتِ انسانیہ اور حیوانیہ کا باعث ہے۔

نظامِ کائنات میں نبضِ زندگانی چل رہی ہے۔ خُدا کی قدرت کے تصرّفات ان آیات سے ہویدا ہو کر انسانیّت کو اپنی طرف متوجّہ کر رہے ہیں۔ ابھی چشمِ فلک انسانی معراجِ کمال سے مطمئن نہیں ہو سکی۔ اس خدا کی مکرّم مخلوق آدم زادے کے آسمانِ بالا

پر متمکن ہونے کے بعد ہی چشمِ فلک خوش ہوگی - اس واسطے کہ یہی انسان متصرّفِ کائنات ہے جس کے لیے عالمین کی تخلیق فرمائی گئی - اللہ کا منشاء بھی اُسی وقت پورا ہوگا جب اُس کا مکرّم انسان اُس کی توحید پر ایمان لاتے ہوئے کائنات کو اپنے قبضۂ قدرت میں لاتے گا۔

قدُرتِ خداوندی کا مظہرِ اتم انسان ہے اور انسان ہی کے کمال سے کمالِ خداوندی کے عقد کا اتمام ہوگا۔ لہٰذا تفسیرِ قرآن مجید کی تکمیل عملی صُورت میں خُدا کی کائنات پر باحکام الٰہیہ تصرّف حاصل کرنے کے ساتھ ہوگی ۔

قرآن مجید اور فلسفۂ ریاست

وہی شخصیت ریاست میں سیادت کی حامل ہو سکتی ہے جو
ارکانِ خدمت کو جانتی ہو اور ارکانِ خدمت کی مکمل رعایت کرتی ہو۔
اور اس کی خدمت ریاست کے باشندوں کو خودکفیل بنانے میں کفالت کی
ضامن ہو۔خلیفۂ مجاز ہونا یا حاکمِ مجاز ہونا اسلام کی نظر میں ریاست کا کفیل
ہونے کے مترادف ہے۔ اللہ اپنی تعلیمات کے ذریعہ اسلامی حکومت کو
منشائے فطرت کے مطابق معرضِ وجود میں لاتا ہے تاکہ افرادِ سیاست
ہمہ گیر تدبر کی قیادت میں ریاست کو اس قدر ارتقائی حیثیت
دیں کہ وہ اقوامِ عالم کے سامنے نمایاں ہو کر حکومتِ الٰہیہ
ہونے کی گواہی بن جائے۔

قرآن مجید اسلامی ریاست کا تصوّر، ریاست کے باشندوں کو تسلیم و رضائے حق، اور ضابطہ احکاماتِ حق کے ساتھ فطری امور کی تدبیر حاکمیتِ عامتہ النّاس کے ساتھ دیتا ہے۔ وہ حاکمیّتِ مطلق کا سزاوار، اللہ تعالیٰ کو قرار دے کر حاکم مطلق کی حکمرانی کا غلبہ حاکمِ مجاز کے ذریعے کرانے کی پابندی عائد کرتا ہے تاکہ اللہ کی مخلوق ریاستِ اسلامیہ میں امنِ عامہ کے ساتھ خدا کے مفوّضہ منافعوں سے بے بہرہ نہ رہے۔ ریاست کی رُوحانی اور مادّی صلاحیتوں کا منبع تعلیماتِ اسلامیہ کو قرار دیتا ہے۔ اس کے فطری زاویۂ نگاہ میں یہ منبعِ انسانی تعلیمات کا مصدر نہیں بلکہ خدائے برتر کی تعلیمات ہی ریاست کے علوم و فنون کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس مصدرِ تعلیمات کی سطح مرتفع خدا اور اس کے رسُولؐ ہیں۔ یہ اتنا بلند و بالا مقام ہے کہ کوئی بڑی سے بڑی بلندی و پستی یا طُول و عرض اس کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ صرف ریاست کے حاکم اعلیٰ کے حسُن تدابیر اور مفکّرینِ ریاست کی متحدہ تدبیر ان فطری ضوابط سے حصُولِ استفادہ کی مجاز ہے۔ اس واسطے قرآن مجید ریاست کے عوام کی تعلیم و تربیّت کیلئے ان میں سیادتِ حقّہ کا انتخاب کرتا ہے اور سیادت کے جملہ اجزاء کو من حیث المجموع طور پر سیّد القوم کو سونپتا ہے۔

قرآن مجید کا نظریۂ سیادت ریاست میں برائے سیادت نہیں بلکہ قرآن مجید کا نظریۂ سیادت کو خدمت کی اس عظیم سطح پر مامور کرتا ہے جہاں سے وہ اپنی بصیرتِ حاکمانہ کے ساتھ ہر

اعلیٰ وادنیٰ کو دیکھ کر اس کے حق میں بہتر فیصلہ دے اور ریاست کی دُنیائے افادیت سے ریاست کے باشندوں کو مطلع کر سکے اور ان کے حصُول کے لیے انہیں مختلف ساز و سامان سے آمادۂ کار کر سکے۔ اسی لیے سیادت کے انتخاب میں خدمت کو زیادہ لازم کیا گیا۔

سیّدُ القوم خادِمُہم کا اشارہ قوم کے صحیح خدمت گزار کی جانب ہے۔ وہی شخصیت ریاست میں سیادت کی حامل ہو سکتی ہے جو ارکانِ خدمت کو جانتی ہو اور ارکان خدمت کے حقوق کی مکمل رعایت کرتی ہو۔ اور اس کی خدمت ریاست کے باشندوں کو خود کفیل بنانے میں کفالت کی ضامن ہو۔ اس کا صاحبِ علم و ہُنر ہونا، شفیق و غمگسار ہونا، محنت شاقہ کے ساتھ اظہارِ سیادت کرنا، اور سختیٔ منزل کو اپنے لیے متاعِ راہ جاننا۔ اور خندہ پیشانی سے ہر حُسن و قبح کا مطالعہ کرنا، بلیغ النظری اور بلیغ العلمی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینا اور ریاست کے باشندوں کو اس کے متعلق اپیل کرنا اور عملِ پیہم کے لیے صداقتوں کے ساتھ اُن کی حوصلہ افزائی کرنا، جادۂ منزل پر چلنے کے لیے اعمالِ حسنہ اور حکمتِ صالحہ کے ساتھ انہیں تازہ دم رکھنا اور اصولی طور پر ابنائے ریاست کو راہِ زیست پر مسلسل چلتے رہنے کی ترغیب دینا اور قوّتِ عامہ کو تدبیرِ سیاست سے بروئے کار لا کر قوم کو ترقیات کی راہ پر چلانا، ریاست کے اخلاقِ داخلیہ کو صحت مندانہ نہج پر قوی تر بنانا اور ان کو اسلام کے منشائے عظیم سے باخبر رکھتے ہوئے فرائضِ اسلام کی ادائیگی کے لیے کاربند رکھنا وغیرہ۔

سیادت کے ان فرائض کا جو اس پر عائد ہوتے ہیں ان سب چیزوں کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ اللہ حاکم مطلق ہے وہ اپنے مامور حاکم ریاست کو اپنی سنّتِ الٰہیہ کی طرف راغب رکھنے کی تعلیماتِ اسلامیہ کے ساتھ اس طرح دعوت دیتا ہے کہ اس نے خدائے مطلق کے سامنے ریاست کے ایک ذرّے سے لے کر ریاست کی مجموعی حیثیت تک

کی گواہی دینی ہے اور اس سے خدائے مطلق ریاست کے چھوٹے بڑے امُور کے متعلق ضرور باز پرس کرے گا۔

اس مقام پر حاکِم مجاز اسلامی ریاست کے صحت مندانہ خوف و رجا کے ساتھ عدل و انصاف کو ہر شعبۂ زندگی پر جاری و ساری رکھنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ حاکِم مجاز کے سامنے سب سے بڑی امانت اللہ کے سامنے خوف و رجا ہے کہ غلطی پر اس سے شدید باز پُرس ہو گی اور اچھائی سے اس کو بڑے بڑے انعامات سے نوازا جائے گا۔ اسلام نے قرآن مجید میں ایسی سیادت کو جو اسلامی ریاست پر مبنی ہو مُلک امیر، حاکم اور سیدالقوم کے ناموں سے موسُوم کیا ہے۔ کسی طرح بھی ریاست کا حاکم جو ریاست پر مسلّط ہو جائے چاہے وہ عامۃ النّاس کی رائے سے سامنے آئے یا عامۃ النّاس کو اپنی رائے میں لے لے یا حالات کی نزاکتوں کے پیشِ نظر ریاست کو بچانے کے لیے کسی حقیقت کے ساتھ حاکم بن جائے۔ اس کا کسی صورت سے بھی سامنے آنا اسلامی نقطۂ نظر سے تقسیمِ قسمت کے باب میں اللہ ہی کی طرف سے مامُور ہونا ہوتا ہے۔ سوائے اس سیادت کے جو ظلم اور عُدوان کے لیے بروئے کار لائی گئی ہو اور اسلامی اقدار کے لیے مُہلک ہو۔

خلیفۂ مجاز ہونا یا حاکم مجاز ہونا اسلام کی نظر میں ریاست کا کفیل ہونے کے مترادف ہے۔ اللہ اپنی تعلیمات کے ذریعہ اسلامی حکومت کو منشائے فطرت کے مطابق معرضِ وجود میں لاتا ہے۔ تاکہ افرادِ ریاست کو ہمہ گیر تدبیر کی قیادت میں ریاست کو اس قدر ارتقائی حیثیت دی جائے کہ وہ اقوامِ عالم کے سامنے نمایاں ہو کر اپنی حکومتِ الٰہیہ ہونے کی شہادت بن جائے۔ یہ ریاست کی مجموعی حیثیت ریاست میں امنِ عامہ اور عدل و انصاف کے ساتھ سکُونِ کامل پاتی ہے اور دوسری جانب اقوامِ عالم کو دعوتِ حق دینے میں فوزِ عظیم

پاتی ہے۔

قرآن مجید اپنی تعلیمات میں اقتدار برائے اقتدار کا مخالف ہے اور اقتدار کی موجودگی میں اختلاف برائے اختلاف کا بھی مخالف ہے۔ کیونکہ ان دونوں حالتوں میں ریاست بجائے تعمیر کے تخریب کا شکار ہو جاتی ہے۔ عوام الناس کی سیادت سیّد القوم کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر سیّد القوم کامیاب ہے تو عوام کا کامیاب ہونا ایک لابدی امر ہے۔

سیّد قوم کے لیے اقتدارِ ریاست اور اختلافِ ریاست کا ہمہ وقت جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ صحت مندانہ اختلاف یا صحت مندانہ اقتدار کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ یہی دو چیزیں حق و صداقت کی علمبردار ہوتی ہیں۔ ان دونوں قوتوں میں قوی احتساب کا ہونا نظریۂ قرآن کے مطابق ہے۔ اختلاف کے بگڑنے پر جب وہ کسی ذاتی عصبیت کی بناء پر ریاست میں تخریب چاہتا ہو تو اقتدار کا عدالتِ عظمٰی کی طرف سے احتساب کرنا ضروری ہوتا ہے اور اس حالت میں جب کہ اقتدار کسی بگاڑ کی صورت اختیار کرلے جو ریاست کی رُوحانی، مادّی اور ارتقائی قدروں کے لیے مہلک ہو۔ صحت مند اور تعمیر پسند اختلاف کا اس پر محاسبہ کرنا نظریۂ قرآن کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ اقتدار و اختلاف دونوں کا ریاست کی نظریاتی اور فلاحی تعمیر سے تعلّق ہوتا ہے۔

ان دونوں کے وجُود کا تعلق لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ریاست میں اقتدار بالاستحکام لازم ہے اور اختلاف بالاحتیاط اس لیے لازم ہے کہ جس اختلاف میں احتیاط نہ ہو وہ اقتدار کا دشمن ہوتا ہے اور اسلام میں ایسی دشمنی جو اقتدارِ ملکی کے خلاف ہو اس کو سخت قبیح اور شنیع جرم قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی ریاست میں آئینِ فطرت کی ہر جزو کُل کو عدالتِ عالیہ کی دفعہ قرار دے کر

حاکم ومحکوم دونوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں مگر قوّتِ حاکمہ ہر وقت عدالتِ عالیہ کے پاس ہوتی ہے اور خلیفۂ مجاز اس عدالت میں اپنے مدعی اور مدعا علیہ کے سامنے بالکل عوام کے مانند جواب دِہ ہوتا ہے اور اس جواب دہی میں وہ اپنی خجالت محسوس نہیں کرتا۔ اس واسطے کہ اس کا ضمیر اس کی رہنمائی کرتا ہے کہ تو کسی انسانی عدالت کے سامنے جواب دہ نہیں، بلکہ عدالتِ خدائے ذوالجلال کے سامنے جواب دِہ ہو رہا ہے۔ جب حاکم ومحکوم کے تصوّرِ ریاست میں اس قدر عدل گستریاں کارفرما ہو جائیں تو وہ ریاست کیوں کر حُسنِ عمل اور حُسنِ اخلاق کا نمونہ نہ بنے۔ یہی اسلام کا وہ طرزِ تمدّن ہے کہ تہذیبِ سماویہ کی بنیاد ڈال کر قرآن مجید کے فلسفۂ ریاست کی ترجمانی کرتا ہے اور ریاست کے حاکم ومحکوم کے نزدیک ریاست کا بنیادی تصوّر اَلْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحُكْمُ لِلّٰهِ پر استوار ہو کر اوجِ کمال کی بلندیوں پر فائز المرام ہوتا ہے۔

صداقتِ ریاست اصُول کے ڈھانچوں میں ڈھل کر صحت مند بن کر سامنے آجاتی ہے۔ اسلام کا یہی حُسنِ عمل ہے جس کو اپنے اور بیگانے اپنانے کے لیے بے کل ہو جاتے ہیں۔ صدرِ اوّل میں ریاست کا تصوّر اس طرح عملی صُورت اختیار کرتا ہے کہ اس کا حاکم مجاز اللہ کا رسُولؐ ہے جو فطری ہدایتوں کے ساتھ دینِ حق کا آئین ہاتھ میں رکھ کر سر بکف لومۃ لائم سے بے نیاز ہو کر چٹائی پر بیٹھ کر جامۂ فقر زیبِ تن فرما کر میدانِ خدمت میں والہانہ انداز میں دوڑ پڑتا ہے۔

اس آخری سیادتِ کُل کا چہرہ میدانِ خدمت میں گرد آلود ہے۔ مگر کیا مجال کہ دبدبۂ شاہی کے ساتھ کہیں شائبتہً بھی حکمرانی فرمائی ہو، مگر اس کے ساتھ ساتھ حکمرانی ازلی و ابدی صورت میں کائنات کے حکمرانوں کو شرماتی ہوئی فرائضِ حکومت بھی انجام دے رہی

ہے۔ اس میں سیّد العالمینؐ نے قلوب و اذہان پر حکومت حاصل کی۔ دوسرے حکمرانوں کے منصوبے جہاں ارب ہا روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے تھے وہاں اس محبوبؐ کُل کے اشاروں نے وہ کام سرانجام دلوا دیے۔

یہ دِلوں پر حکومت کرنے کا نتیجہ تھا۔ بظاہر حکومت کوئی بھی کر سکتا ہے مگر دِلوں پر حکومت کرنا تعلیماتِ قرآنی نے اعمال اسلامیہ کے ساتھ سکھایا یہ انوکھی طرزِ حکومت صدرِ اوّل کی ریاست میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے انجام دی۔ بظاہر ریاست کو دفاعی صورت بھی اختیار کرنی پڑتی ہے اور اس دفاع سے بالعموم جارحیّت کے امکانات ہوتے ہیں۔ مگر اسلام میں دفاع اسلامی ریاست کے حق و صداقت کا امین ہوتا ہے اور وہ ہر وقت اس امانت کی تکمیل کے لیے چست و چوبند رہتا ہے۔ مگر اس میں جارحیّت مطلقاً نہیں ہوتی۔ اسلام میں ریاست کا تصوّر اپنی حدُود کے اندر رہ کر عزّت حاصل کرنا ہے مگر اس کی روحانی سنجیدگی اور استقامت ظاہری دفاع سے کہیں بلند و بالا ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست میں حاکمِ قوم کو بلاوجہ مُلک سے باہر پاؤں پھیلانے کی اجازت نہیں دی جاتی، بلکہ دوسری ریاستوں میں ظُلم و عدوان بڑھ رہے ہوں تو ان مظالم کو تدبیرِ اسلام سے دُور کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط

"یعنی تم لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف حکمتِ اسلامیہ اور موعظتِ اسلامیہ کیساتھ دعوت دو اور اس کے بعد ان کے ساتھ اس حالت میں کہ وہ راہِ راست پر نہ آئیں تو جدال کرو وہ بہتر ہوگا۔"

اس آیت میں ریاستِ اسلامیہ کو فرداً و اجتماعاً دعوتِ حق دینے کے لیے تدبر حکمت کے ساتھ بلانے کی تعلیم دی گئی ہے اور پھر دوسری حیثیت قولِ جمیل کو دی گئی ہے۔ یعنی اسلام کی میٹھی میٹھی باتوں کے ساتھ جو حقائق سے مملو ہیں، دعوت دو۔ یہاں حکمت و موعظت دونوں کو بیک وقت یا مختلف حالت میں پیش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

حکمت میں خاموشی، تقریر، غلبۂ حق، سامانِ خدمت، جذبۂ محبت، ترحم، صلۂ رحمی بیماروں کی خدمت، جاہلوں کی تعلیم، مسافروں کی خدمت، مہمان نوازی، خندہ پیشانی، شفقت درافت، عفو و درگزر، عدل و انصاف، جلال و جمال، ترہیب و ترغیب، سفر و حضر، حسنِ مجلس حسنِ تجارت، حسنِ حکومت، حسنِ کلام اور صبر و استقامت سب داخل ہیں۔ موعظت حسنہ میں اسلامی پند و نصائح جملۃً شامل ہیں اور جَادِلْهُمْ کو دعوتِ حق کے لیے تیسرا مقام دیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تعلیمات انسانیت سے جدال نہیں چاہتیں بلکہ وہ حکمت اور موعظت کے ساتھ ہی انسانیت کو عدل و انصاف کی تعلیم دے کر اپنا ہمنوا بنانا چاہتی ہیں۔ حکمت و موعظت کو ریاستِ اسلامیہ یا اس کے امرا اگر صحیح معنوں میں اختیار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بلا جدال وہ دوسری ریاستوں کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکیں یہی وجہ تھی اخلاقِ اسلامیہ نے کروڑوں دلوں کو جدال و قتال کے بغیر جیت لیا۔

بدقسمتی سے جب اسلامی ریاستوں پر کوئی بُری نظر ڈالے یا نقضِ امن کا باعث بنے اور حملہ آور کی صورت اختیار کرے یا وہاں کی انسانی آبادی پر بار بار ظلم ڈھائے۔ ایسی حالت میں ان کو پیغامِ حق دینا اور پیغامِ انصاف دینا اسلامی ریاست کا فریضہ ہوتا ہے، مگر

اسلامی ریاست کو حملہ کرنے میں پہل کرنے کی قطعاً اجازت نہیں بلکہ حملہ آور کے لیے دفاع کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

ایسی حالت میں ریاست کے ہر باشندے پر (جو جہاد کی صلاحیت رکھتا ہو) جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ بہرحال اسلامی ریاست کا حاکم خلیفہ ہو یا مطلق العنان بادشاہ، یا دورِ حاضرہ کی صورت کا صدر ہو۔ بہر صورت اس کو صورتِ اسلامیہ کی تعمیل میں حکمرانی کرنی ہوگی۔ ان تینوں صورتوں میں حاکم قوم کو ایسا مطلق العنان ہو جانا جو خدائی تعلیمات سے برگشتہ ہو کر ریاست کی صلاحیتوں سے لاپرواہ ہو کر تعلیم و تربیت سے ہٹ کر، خوف و رجا سے بے نیاز ہو کر، ریاست کی فلاح و بہبود سے مستغنی ہو کر اور خدمتِ انسانیت سے بے بہرہ ہو کر ریاست پر حکمرانی چاہے تو ایسی حکومت کو قرآن مجید کی نظر میں بے بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی بنیادی حیثیتِ اسلامیہ سے ہٹ کر حکومت کرتا ہے۔ یہی حکومت اسلام کی نظر میں عوام کے حقوق غصب کرنے والی حکومت کہلاتی ہے۔

اسلامی ریاست میں اسلامی طرزِ حکومت شوریٰ پر قائم ہوتی ہے جس کو آج کی اصطلاح میں عوامی ریاست کی نمائندگی کرنے والی اسمبلی کہا جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اسلام کی شوریٰ میں نمائندہ قوم کا صاحبِ تدبیر اور صاحبِ حل و عقد اور صاحبِ نظر ہونا اور نمائندگی کے لیے تربیت یافتہ ہونا ضروری امور میں شامل کیا گیا ہے۔

اسلامی ریاست میں حاکمِ ریاست کا نجی طرزِ تمدن اور طرزِ تہذیب طرزِ معیشت اگر اسلامی اخلاق کا گہوارہ ہو تو عوام کے لیے رہنمائی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا صاحبِ استقامت ہونا، صاحب کلام، صاحبِ شجاعت ہونا اور مردِ میدان ہونا اور نوعِ انسانی پر ہر طرح ممیز ہونا اسلامی ریاست کی حوصلہ افزائی کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس کے اشارات و کنایات بھی قوم کے

لیے متاعِ ہدایت ہوتے ہیں۔ اس کا خفی و جلی طور پر ملکی حالات سے مطلع رہ کر انتظامِ ملکی کو سرانجام دینا موکد ہوتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر وہ قوم کا مکرّم ترین اور بزرگ ترین مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اور یہی اس کی آسودگیٔ حکومت کا سبب بنتا ہے۔

بغیر ان امُور کے وہ حکمرانی میں آسودگی نہیں پا سکتا۔ اسلام کی مجلسِ شوریٰ اپنے صدرِ مقام یا خلیفۂ قوم کے لیے صائب الرّاء ہوتی ہے۔ اس کی آرا پر وہ عوام کی حالت کا صحیح جائزہ لیتا ہے۔ اور اس جائزہ کے بعد احکامِ صالحہ کی تنفیذ کرتا ہے۔ اس کی بہت بڑی ذمہ داری ابنائے سنت کے لیے ہوتی ہے کہ ہر فرد اپنی حالت میں مطمئن ہو کر ریاست کے امُور میں محنتِ شاقہ کے ساتھ حصّہ لے۔ صدرِ قوم کی اس محنتِ شاقہ کا نتیجہ بین الاقوامی سطح پر قوم کو معزّز بنا دیتا ہے۔ اس کا یہ بھی فریضہ ہوتا ہے کہ قوم کے اعلیٰ اعمال کے ساتھ آنے والی نسلوں کے لیے تاریخ مرتب کرے۔ جو حاکم اعمالِ صالحہ کے ساتھ تاریخ مرتب نہیں کر سکتا۔ وہ آنے والی نسلوں کا مجرم ہوتا ہے۔

اسلام کا سلسلۂ ریاست قیامت تک کی حدوں سے وابستہ ہے۔ ہدایت کی بازیچوں کو واضح تر کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل ہے تاکہ آنے والی نسلیں آسانی کے ساتھ ان خطوط پر چل کر مزید ترقی کر سکیں۔ حاکم قوم کے لیے جدید تقاضوں کو سمجھنا اور اپنی قوم کو جدید تقاضوں کے مطابق دعوتِ فکر و عمل دینا اشد امُور سے ہے۔ جو حاکم اپنی قوم کو جدید ترین تقاضوں سے بہرہ ور نہیں کر سکتا۔ وہ ریاست کو ناگہانی موت کے لیے تیار کرتا ہے۔

قرآن مجید اسلامی ریاست میں صنعت و حرفت کو فروغ دینے پر زور دیتا ہے۔ اور ہر زمانے کے ان جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان جملہ حالات سے دوچار ہونے کی تعلیم دیتا ہے جو فکرِ انسانی کی کوششوں کے نتیجہ میں جدید صورت میں رُونما ہو کر سامنے آچکی ہیں۔ اور جن سے "انسانیت علیٰ منہاجِ فطرت" استفادہ کر رہی ہے۔ ان سب کے حصُول کی نشان دہی قرآن مجید کرتا ہے۔

مثال کے طور پر اقوامِ عالم کی زندہ ریاستوں نے زندہ معاشرت کے ساتھ میدانِ حکمت اور میدانِ صنعت و حرفت میں جن چیزوں کی تحقیق کی وہ تحقیقات عملی صورت میں میدانِ انسانیت میں رُو بہ عمل آتی ہیں۔ سفر و حضر میں کام آرہی ہیں اور تجارت، صنعت و حرفت، زراعت برّ و بحر اور فضاؤں میں متشکل حیثیت میں متحرک نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید نے ان سب کی نشان دہی کر دی۔ اور بار بار سخّر کے الفاظ ہر چیز کے ساتھ مربوط فرما کر تسخیر کائنات کی دعوت دی۔ چونکہ یہ جملہ سامانِ کائنات جو عقلِ انسانی نے مہیا کیے۔ ریاست کے عوام کی آسائش کے کام آنے والے ہیں۔ اس واسطے ریاست کے انتظامات میں جدید تقاضوں کو شامل کرنا حکومت کی حسنِ کارکردگی کا ایک نمایاں حصہ ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست کے تصوّر میں اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہر جدید چیز کو حاصل کرنا منشائے ریاست میں داخل ہے۔

ریاست مجموعی قوت کا نام ہے۔ جو مجموعی فکری قوّتِ انسانیت کے ساتھ محیّر العقول کارناموں سے دنیائے انسانیّت کو اسلام کی طرف مخاطب کر سکتی ہے۔ فلسفۂ ریاست حُسنِ انتظام کے ساتھ علم و عمل کو بروئے کار لانے کا ضمنی نام ہے۔ ریاست کی امامت حکمران کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس واسطے وہی مرجع الحالات ہوتا ہے اور اس کی ذات اپنے دفاع اور حملہ کارکردگی کے ساتھ مرجع الحالات ہوتی ہے۔ قوم کی مایوسی، اور امید کا منبع وہی ہوتا ہے۔ تمام اخلاق اور بداخلاقیوں کی ذمّے داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

قرآن مجید کا فلسفۂ ریاست خلافتِ ارضی پر مختلف حالتوں میں ترجمان ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ خلافتِ کبریٰ کا مجاز انسان ہے اور اس خلافت کبریٰ کی انجام دہی کے لیے اُسے تقویٰ کے ساتھ حکمرانی کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ط

کائناتِ ارضی پر تصرفات حاصل کرنے کے لیے ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کو جملہ مسمیات کا علم عطا فرمایا گیا۔

اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن مجید کی تشریحات میں مخلوقات کی تشریح انسان کے لیے ضروری ہوئی۔ علم الٰہی بہ اندازِ الہام کلام کی صورت میں اور نصابِ تعلیم کی صورت میں انسانیت کو دیا جاتا ہے۔ مگر اس کی صورت مختصر ہوتی ہے اور اسماء کُلّھا میں کتابِ زندگانی کی ظاہری و باطنی صورت اور عالمین کی ظاہری و باطنی صورت اجزائے تحلیل کی صورت میں خلیفۃ الارض کے سامنے رونما ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد انہیں استخلافِ ارضی کا سزاوار قرار دیا جاتا ہے۔ اس واسطے علم الاشیاء کی تعلیم و ترویج کا ریاست میں اہتمام کرنا حاکم ریاست کے فرائض میں داخل ہے۔ سائنس کی تمام تر معلومات کا ثبوت اس آیت سے میسر آجاتا ہے۔

قرآن مجید آئینِ ریاستِ اسلامیہ ہے اور پوری انسانیت کو ریاست اسلامیہ کے اعمال کے ساتھ اپنی جانب دعوت دیتا ہے۔ قرآن مجید چاہتا ہے کہ اس کے پیروکار "انفس و آفاق" پر مسلّط ہو کر خدا کی حکمرانی مطلق کا ثبوت پیش کریں۔

چونکہ دورِ حاضرہ میں خلافت اسلامیہ کی اصلی حیثیت بظاہر معدوم العمل ہے۔ اس واسطے دورِ حاضرہ کی اسلامی ریاستوں کے لیے سیادت کے انتخاب پر طرزِ صدارت کی حکومت ہی قرینِ خلافت ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں بہ نسبت دوسری جمہوریتوں کے ضوابط زیادہ ہیں اور یہ مجموعۂ قوت بننے کی ایک اچھی صورت ہے۔

آج اسلامی ریاستوں کے صدر رائے عامہ سے سیادت حاصل کرتے ہیں یا نزاکتِ حالات کے مطابق رائے عامہ کو ہمنوا کر لیتے ہیں۔

ان دونوں صورتوں میں وہ عوام کے دلوں کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ اگر تھوڑی تدقیق کے بعد

وہ اپنی شوریٰ یعنی نمائندہ قومی اسمبلیوں کو تربیّت فکر و عمل دیں جو اسلامی مزاج کے مطابق ہو تو صُورتِ خلافت صُورتِ صدارت میں بروئے کار آسکتی ہے۔ اور یہی صحت مندانہ طرزِ حکومت اپنی ریاستوں میں خلافت کے لیئے راہیں مہیّا کر سکتی ہے۔

اس کے لیے قرآن مجید کی تعلیمات کو صحت مند مفکرین کے حوالے کرنا ضروری ہے۔ اگر ریاست ہائے اسلامیہ متحدہ طور پر صالح مفکرینِ اسلام پر مشتمل ایک مرکزی تحقیق گاہ بنالیں اور اس کے ذریعہ قرآن مجید کے ان احکام کو یا اس کی جُملہ دفعات کو اسی کی ترجمانی کے مطابق ہر زمانہ کے حالات پر منطبق کرتے ہوئے عالمِ انسانیت کے سامنے پیش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان انسانیت کی امامت پر فائز نہ ہو۔

اسلامی ریاست میں جمہوری پارلیمانی طرزِ حکومت ہو یا صدارتی طرزِ حکومت۔ دونوں میں اسلامی مزاج رکھنے والی شوریٰ کی ہمہ وقت ضرُورت ہے۔ زمانہ کی مجبوریوں کے پیشِ نظر حالت اضطرار میں اگر طرزِ خلافت نہ میسّر آسکے تو بھی طرزِ خلافت کے نظریہ کو اسلامی ریاست کے اکابر اور عوام کے ذہنوں میں محفوظ رہنا چاہیئے۔ ایسی حالت میں جمہوری پارلیمانی طرزِ حکومت یا صدارتی طرزِ حکومت (دونوں) کو عوام کی رائے پر حکومت مرتب کرنی چاہیئے۔ اور ان کا آئین اور منشور بالکل کتاب و سنت کے مُطابق ہونا چاہیئے۔ تاکہ ریاست اندرونی اور بیرونی طور پر اسلامی عدالت کو منوا سکے۔ اگر ریاستِ اسلامیہ اقدارِ عدالت اور اسلامی طرزِ حکومت کو نہ منوا سکے۔ تو یہ اُس کی اسلامی کم فہمی پر منتج ہو گا۔ خُدانخواستہ اسلامی ریاستیں کسی طرزِ حکومت سے بھی اسلامی ریاست کی عملاً ترجمانی نہ کر سکیں۔ تو یہ مسلمانانِ عالم کی بدقسمتی ہوگی۔ حالانکہ اسلامی حکومتوں نے اعلیٰ سیاسی انتظامات کے ساتھ حکومت کرنا انسانیت پر ثابت کر دیا تھا۔ متاخرین مسلمانوں نے آج کے دوران میں مغربی طرزِ حکومت کو اپنانا شروع کر دیا

جس سے اسلامی ریاست اجنبیت کی صورت پیدا ہو گئی اور مسلمانوں کو اس کے نوائرے سے الگ ہو کر ریاستِ اسلامیہ کے سمجھنے میں زیادہ اُلجھنا پڑا۔ اس اُلجھاؤ نے ہمیں منزل سے کافی دُور کر دیا ہے۔ جب تک از سرِ نو پھر طرزِ خلافت کی طرف مسلمانانِ عالم متوجہ نہ ہوں گے وُہ آئے دن غیر اسلامی رسومِ حکومت کا شکار ہوتے رہیں گے اور آنے والی نسلیں سیاست کے حق و باطل سے بے خبر رہ کر اسلامی تہذیب و تمدن سے محروم در محروم ہوتی چلی جائیں گی۔ اور اس کی ذمہ داری اکابرینِ اسلام پر ہوگی۔ مناسب ہے کہ اسلامی ریاستیں پارلیمانی طرزِ حکومت یا صدارتی طرزِ حکومت کے ساتھ عوام کی رائے پر حکومت کریں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وُہ اپنی اسمبلیوں میں تربیت یافتہ افراد کو شامل کریں اور آئین میں اُنہی لوگوں کو نمائندگی کا انتخاب لڑنے کے لئے اجازت دی جائے۔ جو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سیاستِ اسلامی اور حالاتِ زمانہ کے مطابق سیاست کی عملی فضیلت پا چکے ہوں۔ اگر اسلامی ریاستیں اسمبلیوں کو اسلامی شوریٰ کی حیثیت نہ دے سکیں گی تو ایسی حالت میں خطرناک قسم کے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ جو اسلامی تعلیمات کے لئے مہلک ترین شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ اگر صدارتی طرزِ حکومت جو قرینِ خلافت ہے عوام سے رابطہ نہ قائم کر سکے۔ اور مذکورہ دستورالعمل کے مطابق رائے نہ لے سکے تو یقیناً صورتِ حالات سخت ترین ہو جائے گی۔ اور پھر ایسے حالات کا تحمل معدوم ہو جائے گا۔ چونکہ ملک و عوام کا کندھا اتنے نازک ترین حالات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ دونوں قسم کی حکومتوں کے صائب الرائے شوریٰ کے بغیر حکومت گراں بار ہو سکتی ہے۔ ریاستِ اسلامیہ میں عوام کی قدرِ مشترک صرف اسلام ہے۔ اگر داخلی قدرِ مشترک پامال ہو جائے تو نظریاتِ حکومت دوسروں کے مستعار لئے جائیں گے۔ اور یہ بنیادی غلطی ہے۔

قرآن مجید اور مساوات

قرآن کریم اسلامی ریاست میں دولت کے غیر متوازن ہونے کے خلاف ہے۔ وہ امیر کو اسی وقت امارت کا مجاز کہتا ہے جب وہ لوگوں کے لیے نفع رساں ہو اور اس کی امارت اپنے ساتھ بہت سے لوگوں کو آسودہ حال کر سکے۔ ایسے اُمراء کے متعلق قرآن کریم بشارت دیتا ہے کہ وہ دُنیا و عقبیٰ میں خوش حال رہیں گے۔

قرآن مجید آئینی اعتبار سے اتنی بلندیوں سے انسانیت کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے اور اس کی تعلیمات انسان کو اتنا اعلیٰ و ارفع بنانا چاہتی ہیں کہ وہ اپنی حقیقی عظمتوں سے ہمکنار ہو سکے۔ اس کے لیے وہ بنی نوع انسان کے سامنے کسی جنبہ داری سے کام نہیں لیتا بلکہ وہ انسانیت کو ایسی راہوں پر گامزن کرنا چاہتا ہے۔ جن پر انسان کو ہر وہ سعادت مل سکے جو اس کے لیے ہر حال میں مفید ہو۔

قرآن کی بے مثال تبلیغ پوری انسانیت سے حُسن سلوک روا رکھتے ہوئے جماعت بندی سے میدانِ عمل میں آنے کی دعوت دیتی ہے۔ وہ بنائے توحید و رسالت کے ساتھ ترتیب وار انسانی ضرورت کے مطابق اس کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے ایسے اعمال کی تلقین کرتا ہے۔ جو انسانی تکرّم کے مطابق نیک ہوں۔ انسان کے لیے خوش کن ہوں اور وہ واقعتہً اس سے طمانیت پا سکے۔

وہ انسانیت سے کوئی مستعار سودا نہیں کرتا بلکہ حصُولِ مقصد کی راہ میں ہاتھوں ہاتھ سلسلہ وار منزل بمنزل جزا کا وعدہ کرتا ہے۔ اس کی تعلیم ذہنِ انسانی کو ہر میدان میں مطمئن دیکھنا چاہتی ہے۔

قرآن حکیم اجتماعِ انسانی کی آسُودگی کے لیے حقائق کو دِلوں پر وارد کرتا ہے۔ تاکہ بر ظاہر ہونے والا عمل دِل کی گہرائیوں سے نکل کر عمل خیر بنے۔ وہ ہر اس بات یا عمل کی ضرور نشان دہی کرتا ہے جو مفادِ عامہ سے متعلق ہو اور اس کے ساتھ ہی ہر اس قول و فعل کی بھی نشان دہی کرتا ہے

جو انسانی مفاد کے خلاف ہو۔

قرآن مجید ہر اچھے عمل کی تعریف اس کی مہلک ضد کی تنقیص کے ساتھ کرتا ہے تاکہ عاملِ اعمال اچھائیوں کا انتخاب کرتے ہوئے اس کی مقابل مہلک اضداد کا تعارف حاصل کرتا چلا جائے اور برائیاں اس کے ذہن نشیں ہو جائیں تاکہ نیکیوں کی راہ میں دوبارہ بھولے سے بھی ان بُرائیوں کے نزدیک نہ پھٹک سکے۔

قرآن مجید بنیادی نیکیوں سے آغاز کرتا ہے اور ان نیکیوں کے استحکام کے لیے مدافعانہ انداز اختیار کرنے کی تلقین بھی کرتا ہے وہ کبھی کسی حال میں یا کسی جگہ پر اشارۃً یا کنایۃً بھی بُرائی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

قرآن حکیم کے اتنی ضخیم کتاب ہونے کے باوجود کسی محل پر بھی اس میں سے کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس نے کسی کے ساتھ بُرا سلوک روا رکھنے کی اجازت دی ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہر مخاطب کو اپنے دل میں وسوسے کے طور پر بُرا خیال کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا بلکہ وہ ناکردہ گناہوں سے بھی مجتنب رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

قرآنِ کریم من حیث المجموع نیکیوں کا حتمی خزینہ ہے اور سراسر بُرائیوں کا قاطع۔ وُہ انسانی معاشرہ کو ہمہ وقت نیکوکار ہونے کی تعلیم دیتا ہے اور دیارِ انسانیت سے خفی و جلی بدیوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ انسانیّت کو اجتماعاً نیک بنانے کا مدعی ہے۔

قرآن حکیم کی یہ تقسیم عمل مساویانہ ہے۔ وہ صرف حق و باطل کے امتزاج کے ساتھ مساوات نہیں چاہتا۔ وہ مساوات کی بنیاد تقوٰی پر رکھتا ہے اور یہ تقوٰی ہر عامل قرآن کے مبادیات میں کارفرما ہو کر اسے جملہ نیک اعمال کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔ یہ ترتیب تقسیم فطرت کے ازلی دستور کے عین مطابق ہے۔ وہ کسی چیز کی نوعیت کو اعمال کی ادائیگی میں پامال نہیں کرتا بلکہ

ہر مزاجی نوعیت، شکلی نوعیت اور حرکی نوعیت کو احکام کا پابند بناتا ہے۔ مگر اس کا منشا یہ ہے کہ نوعیت کے اعتبار سے میدانِ عمل میں ہر فرد یا جماعت یا ریاست کا اس کے عمل سے تعارف کرایا جائے اور عملی دنیا میں امتیازات حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے ہر مخاطب کو صفِ اوّل حاصل کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

اس حسنِ تبلیغ سے صراطِ مستقیم کا صحیح سُراغ مل جاتا ہے اور وہ روشن ہو جاتی ہے۔ دریا کی روانی امواج پیدا کرتی ہے اور موج کی نوعیت روانی سے متعلق ہو کر بھی موج ہی رہتی ہے۔ دریا دریا رہتا ہے۔ دونوں ایک ہی جہاں میں اپنے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں، مگر روانی کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے ساتھ مدّ و جزر پیدا کرتی ہے۔ ہواؤں کے طوفان مختلف شکلوں میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ نشیب و فراز میں ان کا یہ کردار مسلسل اپنا کام انجام دیتا ہے۔ جغرافیائی حالات کے مطابق ہواؤں کے پیچ و خم حاصل کرنا، اس کا نرم و سخت ہونا اس کی نوعیتِ اصلیہ میں کوئی تغیر پیدا نہیں کرتے۔ اس طرح کائنات کی تمام متحرک روانیاں اپنے تسلسل کے ساتھ ہزار نوعیتیں اختیار کرتی ہیں۔

طلوعِ شمس کی نوعیت، نوعیتِ صبح، نوعیتِ نصف النہار اور نوعیتِ شام، اگرچہ مختلف ہیں، مگر ان کا مقصد ایک ہے۔ ان جملہ واردات کا تعلق اپنی منہاج پر چلنا ہوتا ہے اور اپنے مقصد کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ ان کے آثار چڑھاؤ سے ان کے مجوزہ مقصد میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی یہی رواداری ان کی صداقت کی گواہ ہوتی ہے۔ مختلف مقامات پر اشیائے عالم کو ان کی نوعیت کے مطابق تربیت دی جاتی ہے۔

بالکل اسی طرح قرآن مجید کی تعلیمات پورے عالم میں جغرافیائی حیثیات کے پیش نظر پورے مزاجِ انسانی پر نیکی مسلط کرنا چاہتی ہیں۔ اس نے اس تقسیمِ عمل میں خدائے لم یزل کی ربوبیت

ہیں اس کی رحمانیت کو اور اس کی حکومت کو پوری انسانیت کے لیے "شفیق" قرار دیا ہے۔ دلیل کے طور پر وہ خدا کی حکومت میں اس کی رحمانیت کو ہر چیز کے لیے مساوات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس کی مخلوقات میں سے کوئی ایسی شے باقی نہیں بچتی جو اس کے احاطۂ رحمت سے باہر ہو۔ اس کے جاری کردہ کائناتی عوامل اس کے منشاء کے مطابق انسانیت پر یکساں طور پر اپنے عمل کو جاری رکھتے ہیں۔ اس کی رحمانیت کی یہ مثال مخاطب کے لیے مساوات پیدا کرنے کی دلیل ہے۔

سورج کسی ایک انسان کے لیے طلوع نہیں ہوتا۔ کسی شاہی محل ہی کو منور کرنا اس کا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہر گوشۂ عالم کو اور اس کی ہر چیز کو منور کرنے کے لیے طلوع ہوتا ہے۔ ایک بے نوا دریوزہ گر کے جھونپڑے سے لے کر ایوانِ شاہی تک برابر ضیا پاشی کرتا ہوا غروب ہو جاتا ہے۔

آتش، آب، باد و خاک کے جملہ عناصر کائناتی عوامل میں داخل ہیں جن سے انتظامِ کائنات مکمل ہوتا ہے اور ان کے عملی انتظامات میں چھوٹے اور بڑے کی تمیز نہیں ہوتی۔ یہ سارے کائناتی عوامل خدائی رحمانیت کا مظہر بن کر درسِ مساوات دیتے ہیں اور ان کے قدرتی منافعوں سے خدا کی مخلوق یکساں طور پر استفادہ کرتی ہے۔ کائنات اپنی قدرتی تقسیم کے ساتھ اسی ہنج پر چلتی ہے جس پر اسے چلایا گیا ہے۔

یہ اس کی فطری عادت ہے جس میں وہ تغیّر اور تبدّل کرنے کی قطعاً مجاز نہیں۔ بس اس کو خدمت کے لیے مامور کیا گیا ہے۔ جس خدمت کے لیے وہ مامور ہے وہ اس سے سرزد ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔

قرآن کریم کا مخاطب تمام کائنات نہیں، بلکہ اس کا مخاطب "انسان" ہے۔ منتشر اور مختلف

نظریات نے انسانی برادری کو ایسے تعینّات کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ وہ اپنے نظریات کے دائروں میں عالمی سطح پر نخوت پسند ہو گئی۔ یہی نخوت پسندی قاتل مساوات ہے۔ ہر سرا اپنے غرور کا متوالا ہو کر دوسرے کو نیچا دکھانے کی عادت کا شکار ہو جاتا ہے اس سے انسانی معاشرہ طوائف الملوکی کا شکار ہو جاتا ہے جو اپنے گردوپیش بے دست و پا انسانیت کو محتاج پا کر خوش ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ کا طبقات میں تقسیم ہونا بھی اسی جرم کی پاداش ہے ورنہ انسانیت کبھی ایک دُوسرے سے جُدا نہ ہوتی۔

اولادِ آدم ایک ماں اور ایک باپ کی نسل ہو کر اختلافِ طبقاتی کا قطعاً شکار نہ ہوتی۔ مگر مفادِ نفسانیہ نے اس نخوت کے ساتھ اپنے لیے ہزاروں راہیں تجویز کیں۔ یہی نخوت و ناموس غرُور کی صورت میں سامنے آیا اور تشہیرِ نفسی، اغراضِ نفسی اور مفادِ نفسی کا غرُور باقی رہا۔ بانیٔ نخوت و ناموس تکبّر ہے۔ جس کی عادت ظلم و تعدی، بغاوت، خون ریزی اور مطلق العنانی ہے۔

اس کی موجودگی میں عوام درجۂ بہیمیت سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور انسانی صلاحیتیں استکبار کی سخت چٹانوں کے نیچے دب کر پامال ہو جاتی ہیں اور انہیں کبھی اُٹھنے کا موقع نہیں ملتا۔

خدا کی رحمت بھری آنکھوں نے ان نخوت و ناموس کے دیوتاؤں کو عامۃ النّاس پر بہیمانہ ظلم کرتے ہوئے دیکھا تو اپنے رحم و کرم سے قرآن مجید جیسا مکمل آئین انسانیت کو عطا فرمایا۔ اور اسی پر عمل پیرا ہونے کے لیے نوعِ انسانیت کی سب سے بڑی امین و صادق و مصدوق شخصیت حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو منتخب فرما کر قول و عمل کے ساتھ راہِ عمل پر چلانے کے لیے مبعوث فرمایا اور قرآن کریم کی مساواتی تقسیم عمل کو ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں

میں دے دیا۔ یہ خدا کے امری عوامل میں حتمی عمل تھا۔ جس نے اپنے پورے اعمال سے ثابت کر دیا کہ بڑائی خدائے لم یزل کے لیے ہے۔ استکبار اسی کی شان ہے۔ اس صفت کا سزاوار اللہ رب العزت کے سوا کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا جو استکبار کرے گا۔ ظالم ہو جائے گا۔ قرآن کریم اپنے مخاطب کو یا پیروکار کو ان تمام مفاسد سے بار بار بچاتا ہے جن سے غرور کی تخلیق ہو۔

انسان کی عادت ہے کہ جب اس کی صلاحیت آشکار ہو تو وہ اس پر غرور کرتا ہے۔ یا کسی میں کوئی حیران کن صلاحیت دیکھے تو اس پر اس طرح حیرت کرتا ہے جیسے وہ خود اس کا خالق ہو۔ حالانکہ انسان اور اس کی جملہ صلاحیتیں اس کی اپنی تخلیق نہیں بلکہ خدا کی تخلیق ہے تفویض ہوئی ہیں۔ جب ذہن انسانی مخلوقات کی صفات پر حیرت کرتے ہوئے اس کے پیدا کرنے والے پر حیرت نہ کر سکے تو لازمی طور پر حیرت کی بنیاد غلط ہو جاتی ہے۔ اور بجائے اظہار عجز و نیاز کے انانیت نفسی کا اظہار شروع کر دیتا ہے۔ جس سے غرور نفسی کی نمود ہوتی ہے۔ اور یہی غرور اپنی بڑائی کا سکہ منوانے کے لیے دوسروں کو چھوٹا دیکھنے کا متمنی ہو جاتا ہے اور اس غرور سے انسانی مساواتی حقوق تباہ ہو جاتے ہیں۔ جن جن چیزوں سے غرور پیدا ہو سکتا ہے ان سب کی قرآن کریم نے ذہن انسانی سے بیخ کنی کرنے پر دلائل کے ساتھ زور دیا ہے۔ اگر قرآن کریم کے ان دلائل پر غور کیا جائے، تو ذہن انسانی ان خرابیوں سے نجات پانے میں خوشی محسوس کرے۔

غرور پیدا کرنے والی چیزوں میں جوانی، حسن، مال و دولت، جائداد، علم و ہنر، حکومت، ریاکاری، حسد کینہ، برائے نام وضعداری، جسم، لالچ۔ اعجاب نفسی اور بخل وغیرہ وہ چیزیں ہیں جو اکثر غرور کا باعث ہوتی ہیں۔ حالانکہ یہی چیزیں صالح ہو کر

خدمتِ انسانیت میں کام آسکتی ہیں اگر صالحیت کے راستے سے غرور، حسد، کینہ، برائے نام وضعداری لالچ، بخل اور اعجابِ نفسی کو ہٹا دیا جائے تو انسانیت کے لیے سراسر رحمت بن جاتی ہیں اور یہی قبیح عاداتِ انسانی حسنات کے راستے میں آکر اس پر افادیت کی راہیں بند کر دیتی ہیں۔

ان شنیع عادات کا سب سے پہلا ردِّ عمل نیکی پر یہ ہوتا ہے کہ مساوات کچل جاتی ہے۔ مساوات کے کچل جانے کے بعد عوام الناس کی فریادیں ان کے سینے میں دبک کر رہ جاتی ہیں۔ یہی فریادیں بعد میں انتقامی نوعیت اختیار کر لیتی ہیں اور یہ انتقام کچھ مدّت کے بعد اتنی سخت صورت اختیار کر لیتا ہے کہ اس سے ایوانِ شاہی کے امن و آسائش میں بھی خلل واقع ہو جاتا ہے۔

یہ وہ خلل ہے جس سے تمام رعونتیں لرزہ براندام ہو جاتی ہیں۔ اس خلل کا مطالبہ انسانی صلاحیتوں کی مساوات ہوتا ہے۔ اگر اکابرِ قوم حسنِ مساوات کو عملی جامہ پہنانا چاہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ عوام کی زندگانیاں سطحِ انسانی پر نمودار نہ ہو سکیں اور اگر عوام سطحِ انسانی پر نمودار ہو کر آسودگی پالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اکابرِ قوم کی آسودگی مستحکم نہ ہو سکے۔ درحقیقت عوام کی آسودگی اکابر سے اور اکابر کی آسودگی کا استحکام عوام سے وابستہ ہو کر دیرپا ہو سکتا ہے۔

ان دونوں کا رابطہ متقل آسودگی کی ضمانت ہوتا ہے۔ ورنہ آسودگی غیر متوازن ہو کر مفلوج ہو جاتی ہے۔ اس مفلوج زدہ آسودگی سے کوئی طبقہ یک طرفہ طور پر مطمئن نہیں ہو سکتا ہے۔

آسودگیاں ایک ایسا خزانۂ فطرت ہیں جو ایک ایک کر کے انجام کار پھر انسانیت میں پھیل کر منتشر ہو جاتی ہیں۔ دولت و جاہ، حسن و جوانی، علم و ہنر کسی ایک گھر کا ورثہ نہیں

ہو سکتے، بلکہ یہ چیزیں فطرت کے ہاتھوں میں ہمیشہ گردش کرتی رہتی ہیں جس میں ساتھ ساتھ جذبۂ انتقام بھی گردش کرتا رہتا ہے۔ گویا غیر متوازن آسودگی گردش لیل و نہار کے ساتھ چھوٹے بڑوں میں تقسیم ہوتی رہتی ہے جس میں ساتھ ساتھ جذبۂ انتقام بھی گردش کرتا رہتا ہے۔ اس طرح غیر متوازن آسودگی ہی سبب انتقام ٹھہری۔ یہ سلسلہ صد ہا سال تک قوموں میں جاری رہتا ہے کیونکہ اس آسودگی اور انتقام کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ قرآن کریم آسودہ حال لوگوں کو غیر آسودہ حال لوگوں سے بے خبر نہیں ہونے دیتا، وہ ایسی مساوات کا حکم دیتا ہے جس میں وجودِ سیادت کی بھی ضمانت اور سیادت کے ساتھ خدمت کی ضمانت اور خدمت کے ساتھ عوام الناس کی فلاح و بہبود کی ضمانت ہو۔ وہ بلا محنت کسی کو مزدوری کا حق نہیں دیتا۔ وہ کسی طرف سے اکتساب مال میں خنداندازی نہیں چاہتا، بلکہ ہر انسان اپنی طاقت میں اپنی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ سامانِ زندگی مہیا کر سکتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس کے مصرف کے صحیح فرائض بتاتا ہے۔

قرآن کریم کے معین کردہ مصرف کے خلاف جو بھی دولت جمع یا خرچ کی جائے، وہ اسے بخل سے تعبیر کرتا ہے اور بخل کی سزا تجویز کرتا ہے، اسے دنیا و آخرت کے ہولناک انجام سے مطلع کرتا ہے۔ بے جا دولت جمع کرنے والے بخیلوں کو یہ وعید سناتا ہے:

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ

"کہ ان کی پیشانیوں کو اور ان کے پہلوؤں کو ان کی دولت سے داغا جائے گا۔"

اس قسم کی بہت سی وعیدیں ایسے لوگوں کے لیے وارد ہوئی ہیں۔

قرآن کریم کا اسلوب بیان انسان کی صلاحیتوں کی تقسیم پر اس طرح متواتر اپنے بیان کو جاری رکھتا ہے جس سے ہر گام زندگی پر کوئی صاحب مال و دولت انفاق سے بے خبر نہ

ہو سکے ۔

قرآن کریم کی اس تقسیم سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی ریاست کے غیر متوازن ہونے کے خلاف ہے ۔ وہ امیر کو اسی وقت امارت کا مجاز کہتا ہے جب وہ لوگوں کے لیے نفع رساں ہو اور اس کی امارت اپنے ساتھ بہت سے لوگوں کو آسودہ حال کر سکے ۔ ایسے امراء کے متعلق قرآن کریم بشارت دیتا ہے کہ وہ دنیا و عقبیٰ میں خوش حال رہیں گے ۔ ایمان بالغیب و اقامت الصّلوٰۃ کے بعد وہ انفاقِ مال پر زور دیتا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ

" یعنی اہلِ ایمان وہ ہیں جو توحید و رسالت پر ایمان لانے کے بعد نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کریں ۔ "

اس آیت میں انفاقِ مال کی کسی واحد مال کے ساتھ تخصیص نہیں کی بلکہ وہ صلاحیت جو اللہ نے اہلِ ایمان کو دے رکھی ہے ۔ اس میں سے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں ۔ ایسے لوگوں کو :

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ط

کی بشارت دی ۔ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو صحیح راہ پر ہیں اور یہی فلاحِ دارین پانے والے ہیں ۔ اس فلاح کا تعلق دنیا کی آسودگی اور عقبیٰ کی فلاح پر مرتّب ہوتا ہے یقیناً وہ لوگ جو دنیا میں اپنی صلاحیتوں کو عوام کے لیے مصروفِ خدمت رکھتے ہیں ۔ عوام کی مصیبت میں ان کو امداد مہیا کر کے دنیا میں اجتماعی خوشی حاصل کرتے ہیں ۔۔۔ عقبیٰ میں اپنی سخاوت کی بنا پر اپنے عوام کے ساتھ نجات پائیں گے ۔

قرآن کریم میں ایسے تصوّر کو بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے جس میں عوام کے خلاف صرف

اپنی ذات کے لیے فلاح کی تمنّا کی جائے۔

قرآن کریم انجام کاران ہی امراء کو امیر کہتا ہے جو عاقبت میں نیک لوگوں کے ساتھ نجات کے خواہش مند ہوں۔

قرآن کریم اس طرح ساری دنیا کے لیے پیغامِ فلاح ہے جس طرح خدا ساری دُنیا کے لیے مربّی ہے اور امیر اوّلین و آخرین حضرت سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، محمد مصطفےٰ، احمد مجتبےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم بھی سنّت اللہ کے مطابق قرآنی ہدایات کی تعمیل میں پوری انسانیت کے لیے فلاح و نجات کے پیامبر بن کر تشریف لائے۔

ہر آئین کا وجُود آئین ساز سے متعلق ہو کر عملی جامہ اختیار کرنے کے لیے ایک کامل علمبردار چاہتا ہے۔ کوئی آئین کسی سچے علمبردار کے بغیر جامۂ تکمیل نہیں پا سکتا۔ چنانچہ قرآن کریم نے جس طرح چاہا، اسی طرح سرورِ کائنات، سیّد الکونین علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے اس کو عملی جامہ پہنایا۔ قرآن آخری آئین ہونے کی حیثیت سے علمی میدان میں علمبردارِ حق و صداقت کے ذریعے اپنے اعمال کی تکمیل کرا چکا ہے جس کی مثال قرونِ اولیٰ نے بہ احسن پیش کر دی تھی۔

قرآن مجید کے آخری نظریہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اقوامِ عالم نے جو جو نظریات تجویز کیے ان میں سے کسی طرح بھی فطری نیکی کی رہنمائی نہ ہو سکی۔ اس ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ دُنیا میں نظریات کے جتنے علمبردار گزرے ہیں اور موجود ہیں۔ انانیتِ نفسی کے شکار ہوئے ہیں۔ وہ مساوات کی داغ بیل ڈالنا چاہتے ہیں مگر انجام کار وہ نفس کی تلخ اور خشک آبیاری کے ساتھ مرجھا کر خشک ہو جاتے ہیں۔ ان کی بنا بر مساوات خوفِ خدا پر نہیں رکھی جاتی بلکہ خواہشاتِ نفس پر تعمیر کی جاتی ہے۔ اور نفس ایسی شاخِ نازک ہے جس پر کبھی آشیانہ تعمیر نہیں ہو سکتا۔ اسے خجالتِ نفس کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اشتراک پسندوں نے مساوات کے جو خدوخال

بیان کیے ہیں اور جن پر وہ مساوات کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر وہ بڑے جاذب نظر ہیں مگر باطن ان کی اصل نفس ہے۔

یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جو چیز جہاں سے اٹھتی ہے۔ وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا کے جس کونے سے سفر کیا جائے۔ انجام کار مکمل سفر اسی پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ بات آج کی سائنس نے بھی ثابت کر دی ہے۔ حکمائے وقت نے بھی اس بات کو ثابت کر دیا ہے اور ان کی جانچ پڑتال میں یہ چیز آ چکی ہے کہ برائی کا انجام برائی ہوتا ہے اور نیکی کا انجام نیکی ہوتا ہے۔ جو چیز نفس سے اٹھ کر سامنے آئے اس کا اختتام بھی نفس پر ہوتا ہے اور نفس ہر قسم کی پریشانیوں کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور فانی بھی ہے۔

نفس ایک غیر مطمئن شے ہے۔ جو سارے جہان کی آسودگیوں کے ساتھ بھی مطمئن نہیں ہو سکتا اور صاحب ایمان صرف ایک نعمت سے بھی مطمئن ہو سکتا ہے۔ کیونکہ صاحب ایمان شکر گزار ہے۔ جتنا زیادہ سے زیادہ اسے ملتا جائے گا۔ وہ شکر گزاری میں اسے وصول کرتے ہوئے اپنے جیسے انسانوں تک فیوض و برکات پہنچاتا ہوا مقصود مطلق کی رضا چاہے گا۔ قرآن کریم ہدایت دینے میں مساوات اختیار کرتا ہے اور اعمال کی تقسیم میں بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ کے ساتھ کرتا ہے۔

بڑوں کے ذمہ بڑی ذمے داریاں اور چھوٹوں کے ذمے تعمیل حکم کی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ اس اطاعت شعاری سے جو منافع میسر آئے اسے یکساں تقسیم کرتا ہے۔ بارش کا پانی جس طرح نشیب و فراز دونوں پر برستا ہے۔ اسی طرح اکابرین کی صلاحیتوں کو چھوٹوں میں تقسیم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس نے خدا کی حکومت منواتے ہیں بنی نوع انسان کو آزادی تسلیم کرنے والوں کو اپنے آئین کا مطیع قرار دیا اور نہ تسلیم کرنے والوں

کے لیے دعوت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا۔ اس کی سخاوت اور مساوات کا یہ عالم ہے کہ اپنے اطاعت گذاروں کو ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کی تلقین کرتا ہے۔ وہ ربّ المسلمین ہی نہیں بلکہ وہ ربّ العالمین ہے۔ دنیا کا کوئی بھی آئین ساز انسان ایسا آئین نہیں دے سکتا۔ جو اپنے پیروکاروں کے لیے مربّی ہونے کا عوام الناس کی عمومیّت کی تربیّت کے ساتھ دعوٰی کرے۔

قرآن کریم جہاں اپنے آپ کو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کہتا ہے۔ وہاں وہ ببانگِ دہل اعلان کرتا ہے کہ میں ھُدًی لِلنَّاسِ بھی ہوں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں بالتخصیص اطاعت گذاروں کے لیے ہدایت ہوں اور بالعموم میرا دروازہ پوری انسانیّت کے لیے کھلا ہے۔ اس کی بہتر مثال یہ ہوسکتی ہے کہ زرخیز زمین کے لیے بارش کا فائدہ خاص ہوتا ہے اور غیر زرخیز زمینوں کے لیے عام ہوتا ہے۔

یہاں بھی قرآنِ حکیم نے تخصیص و تعمیم کے ساتھ اپنی عادلانہ مساوات کا ثبوت پیش کیا۔ اس کے بعد کسی مقام پر اپنے پیروکاروں یا معاشرۂ انسانی کو یہ سہولت نہیں دیتا کہ وہ عُجب سے کام لیں۔ وہ ان کی خصوصیّات کا تعارف کراتا ہے، مگر تقوای کی شرط پر۔ اس طہارت میں وہ بنی نوعِ انسان کو مخاطب کرکے فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط

" اے سارے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت کے جوڑے سے پیدا کیا اور تمہیں خاندانی گروہوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تم ایک دوسرے کا تعارف کرسکو، مگر تم سب میں مکرم ترین وہی ہوسکتا ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔"

اس آیت میں انسانی شعوب و قبائل کا ایسے فطری انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے جس سے طبعِ انسانی انکار نہیں کر سکتی کہ وہ اولادِ آدم ہے اور شعوب و قبائل کی شکل میں اکنافِ عالم میں بٹی ہوئی ہیں۔ مختلف حالات و مختلف زبانوں سے دوچار ہیں۔ کچھ بھی ہو۔ ان سب کی اصل ایک ہے۔ قدرتی طور پر انسان ایک دوسرے کو پہچاننے کی خواہش بھی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر بڑائی جتانے کے متمنّی بھی ہیں، مگر یہ جب انسانی استکبارِ مال و جاہ کے ساتھ اظہارِ تفاخر کرتے ہیں تو اس اظہار سے بجائے شرافت کے "تکبّر" کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی "تکبّر" جذبات کشی کا باعث بنتا ہے جس سے اخلاقی قدریں پامال ہوتی ہیں۔ قرآن مجید نے انسانی شعوب و قبائل کے لیے اولادِ آدم ہونا شرط قرار دیا ہے۔ مگر شرافت کے لیے تقوٰی کو معیار قرار دیا ہے۔

اس مقام پر اِنَّ اَکْبَرَکُمْ نہیں فرمایا، بلکہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ فرما کر تکریم و تکبّر میں فرق کر دیا ہے۔ چونکہ لفظِ اکبر میں اپنے جیسے انسانوں پر بڑائی کا اظہار جذبات کشی کی علامت ہے جو مساواتِ روحانیہ کے لیے سخت نقصان دِہ ہے۔ اس لیے تکبّر انسانی کو شرافت کا معیار قرار نہیں دیا، بلکہ تکریمِ انسانیّت کو انسانی عظمت کا نشان بتایا۔ اور اس کی بنیاد تقوٰی پر رکھی۔

تقوٰی کے معنے اصطلاحِ قرآن میں اللہ حاکمِ مطلق سے خوف رکھنے اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے کے ہیں اور مجوزہ نیکیوں کو حاصل کرنے اور برائیوں سے بچنے کے ہیں۔ نیکی سچّے دِل سے حاصل کی جاتی ہے اور سچّے دِل سے برائیوں سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید سب سے پہلے اپنے جسم و جان پر مساوات کا حکم دیتا ہے۔ پھر اپنے

والدین، ذوالقربیٰ، مساکین، مسافر اور سائلین کے ساتھ مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی ترتیب سے اہلِ اسلام، غیر اہلِ اسلام سے مساوات روا رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اقوامِ عالم، مذاہبِ عالم سب ہی سے حُسنِ مروّت کا حکم دیتا ہے۔ وہ اسلامی احکام و اعمال کو زبردستی کسی پر مسلّط کرنے کا روادار نہیں بلکہ حُسنِ مساوات کے ساتھ تبلیغ کی تجویز پیش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ارشاد ہے :-

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ۔

کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کو حقیر سمجھ کر استہزا نہ کرے۔ کیا تعجب کہ اس میں اس سے اچھے اخلاق والے موجود ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ جس معاملے میں وہ ان کا استہزا کرتی ہے وہ اس معاملے میں یا دوسرے معاملات میں اس سے بہتر ہو۔

یہ اخلاقی حسنِ مروّت ہے جس کی قرآنِ کریم تلقین کرتا ہے وہ یہ بھی ارشاد کرتا ہے کہ تم کسی کے جھوٹے معبودوں کو بُرا بھلا نہ کہو کہ اس کے جواب میں وہ تمہارے سچے معبود کو بُرا بھلا نہ کہیں۔ یہاں تک کہ اسلامی تعلیمات میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تم نیکی کرو اور اس کو بھول جاؤ۔ اس واسطے کہ کی ہوئی نیکیوں کو یاد کرنے سے فخر پیدا ہوتا ہے اور یہی فخر بعد میں تکبّر کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جس سے مساوات کو نقصان پہنچتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں قومی دولت کو سخت احتیاط سے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ کہیں عوامی دولت غیر منصفانہ طور پر خرچ ہو کر عامۃ النّاس کے نقصان کا باعث نہ بنے۔

قرآنی تعلیمات نے محمود و ایاز کے امتیاز کو ختم کر دیا۔ قرآن مجید اپنے پیروکاروں کو

ایسی توجہ، ایسی سوجھ بوجھ اور ایسی غیرت و حمیت دیتا ہے کہ شاہ چٹائی پر بیٹھ کر اظہار عبودیت کرے اور گدا اپنی دریدگی میں خدا پر اتنا ناز کرے کہ سلطانِ زمانہ اس کے سامنے حیران ہو جائے۔ یہ تصورِ قرآنی جو مساوات دیتا ہے اس کا کروڑواں حصہ بھی اشتراکیت نہیں دے سکتی۔ اشتراکیت کی داغ بیل تقسیم مال پر رکھی گئی ہے جس میں دل کا کوئی تعلق نہیں اور اس میں خوفِ خدا کا کوئی شائبہ نہیں۔

اسلام اس کے مقابلے میں اکتسابِ مال کے ساتھ صحیح مصرف کی تعلیم دیتا ہے جس میں خوفِ خدا کا بڑا دخل ہے کہ چھپ کر اور اعلانیہ طور پر جو کچھ کرے گا۔ اس سے اس کا خدا باخبر ہو گا۔ عورت زمین اور مال یہ تین چیزیں ہیں کہ ان کی وراثت سے متروک ہونے کے دعووں کے بعد بھی کوئی قوم ترکِ وراثت پر قادر نہیں ہو سکتی۔ پسندیدگی حسن کی دوڑ آج بھی جاری ہے جس کا تعلق قلب و نظر سے ہے۔ جس پر کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔

بعض قوموں میں عورت کو مشترک سمجھنے کے بعد بھی اس کی پسندیدگی کی دوڑ جاری ہے۔ جس پر ناراضگیاں اور فساد جاری ہیں اور خون خرابہ جاری ہے۔ زمین مشترک ہونے کی صورت میں بھی پسند کی جاتی ہے اور اس کو اپنانے کی داخلی دوڑ جاری ہے۔ اشتراکیت پسند لوگ بھی مکانیت اور سکونت کے لیے اچھی جگہ اور باغات حاصل کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں۔ مال مشترک ہونے کی صورت میں بھی مکتسب کو اکتسابِ مال کے اظہار کے لیے مجبور کر رہا ہے۔ ایسے لوگ زبردست ضابطوں کے اندر بول نہیں سکتے لیکن ان کے دِل ان بندھنوں میں مقید ہیں۔

قرآن مجید ایسے لوگوں کی جو نیک بیوی، نیک اولاد، نیک خاندان تیار کریں حوصلہ افزائی

کرتا ہے۔ مگر سب کو اپنے اپنے مقام پر حُسن مساوات کی تعلیم دیتا ہے تاکہ وہ اپنے لیے ہر خوشی پا سکیں اور مساوات کے ساتھ عدل و انصاف کو بھی برقرار رکھ سکیں۔ باقی دُنیا نے دولت پر ٹیکس عائد کیے جس سے جبر کا اظہار رہتا ہے، مگر قرآن نے دولت پر زکوٰۃ عائد کی ہے۔ جس کا تعلق ایمان باللہ سے ہے کہ زکوٰۃ دینے والا یہ سمجھتے ہوئے کہ میں اللہ کا ہوں۔ میری دولت اللہ کی ہے اور یہ مرنے کے بعد میرے ساتھ نہیں جائے گی۔ میں اللہ کے حکم کی تعمیل میں زکوٰۃ دے رہا ہوں۔

اس سے ایک طرف اخلاق باطن کو تقویت ملتی ہے اور دوسری طرف لوگوں کو اس کا منافع پہنچتا ہے۔ ایک ہزار دولت مند لکھ پتیوں کی صرف زکوٰۃ حکم الٰہی کے مطابق دو کروڑ ۵۰ لاکھ روپے بنتی ہے۔ ایک آزاد اور خود مختار ریاست میں جہاں لکھوکھہا صاحبِ نصاب لکھ پتی، کروڑ پتی اور ارب پتی ہوں۔ اس تناسب سے اگر ان کی سالانہ زکوٰۃ حاکمانہ طور پر وصُول کی جائے اور سالانہ فصلوں کا عشر لیا جائے، تو تعداد اربوں رُوپے بن جاتی ہے۔

اگر خوفِ الٰہی کی بناء پر سارے لوگ قرآن مجید کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے صرف زکوٰۃ اور عشر ادا کریں اور اسلامی حکومتیں خوفِ الٰہی کی بنیاد پر زکوٰۃ وصُول کریں اور خزانہ میں جمع کریں اور قرآن مجید کی تقسیمِ مال کے مطابق عوام کے مصرف میں لائیں تو یقیناً دس سال کی مدت تک اسلامی ریاست میں کوئی گداگر، کوئی مفلوک الحال اور کوئی محتاج نہیں رہ سکتا کہ دوسرے کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔

جب ساری قوم غیر محتاج ہو جائے تو ایسی حالت میں اسلامی ریاست کی زکوٰۃ خزانۂ ریاست سے نکل کر دوسری ریاستوں تک خیرات کو پھیلا سکتی ہے اور یہی زکوٰۃ سفراء قوم،

مبلّغین قوم، اقوام عالم کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کر کے اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کر سکتے ہیں اور یہ زکوٰۃ اسلامی ریاست کو ایسا مشن دیتی ہے جس سے عالمِ انسانیت تک مسلمان ریاست کی خدمت پہنچ سکتی ہے۔ اسلام کی ساری ریاستیں اگر قرآن مجید کے اس نظامِ زکوٰۃ کو صحیح طور پر اپنا لیں تو پوری انسانیت قانون خداوندی کے سامنے دیوانہ وار ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو سکتی ہے۔ اسی واسطے قرآن مجید اس آئینِ فطرت کے مطابق حکم دیتا ہے کہ:-

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ

اس فرمانِ قرآنی کی ہمہ گیری قابلِ غور ہے۔ خالقِ کائنات، ناظمِ کائنات، متحرکِ ہست و بود کی عبادت کرو۔ کوئی طبیعتِ انسانیہ اس سے مفر نہیں پا سکتی۔ اس واسطے کہ انسان معبود نہیں ہو سکتا۔ اس نظریۂ عبادت کے بعد زکوٰۃ ادا کرو یعنی ریاست کے اندر مالا مال ہو کر قطعی آسودہ حال ہو جاؤ تاکہ داخلی احتیاج مطلقاً ختم ہو جائے اور اس مال کو لے کر گلی کوچوں میں اہلِ حق تک پہنچاؤ اور اپنے امیر کی معیت میں نماز پڑھتے ہوئے اللہ کی کبریائی کا مظاہرہ کرو۔

کیا عجب سودا ہے کہ سر خدا کے سامنے جھک رہے ہیں اور مالِ انسانیت میں تقسیم ہو رہا ہے۔ یتیموں، بیواؤں اور بے کسوں کی فریادیں سنی جا رہی ہیں۔ تعلیم ریاست میں عام ہو رہی ہے۔ صنعت و حرفت عروج پر پہنچ رہی ہیں۔ ریاست کے باشندے زراعت میں خود کفیل ہو رہے ہیں۔ دفاعِ ریاست کے لیے سامانِ حرب و ضرب سے لیس ہو رہے ہیں۔ ریاست کے اندر اور باہر، سفر و حضر میں اپنے امیروں کے ساتھ منظم نمازیں ادا کر رہے ہیں۔ لوگوں سے نہایت خوش اخلاقی اور تبسم سے پیش آتے ہیں — ان

کے حُسنِ اخلاق پر دُنیا لٹ رہی ہے اور ان کی طرف دوڑ رہی ہے۔ یہ وہ حُسنِ اخلاق ہے جو دلوں پر حسین قیامت بپا کر رہا ہے۔ کوئی دِل مسخّر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِس زکوٰۃ کے علاوہ ارشاد ہوتا ہے :۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ط

" اے رسُولِ پاک صلّی اللہ علیک وآلِکَ وسلّم! لوگ آپؐ سے انفاق کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپؐ فرما دیجیے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بچے ہوئے مال کو بھی اللہ کی راہ میں حسب ضرورت خرچ کرو۔"

اس آیت کے مطابق کسی وقت بھی انسان کو انفاقِ مال سے بے خبر رہنے کی اجازت نہیں ملتی۔ پھر اخلاقِ باطن کی تربیت کے لیے صدقات کی ادائیگی پر جس صداقت کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کی مثال اقوامِ عالم اور ادیانِ عالم پیش نہیں کر سکتے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی

"یعنی اے ایمان والو! اپنے صدقات، یعنی زکوٰۃ اور نفلیہ خیرات، ریاکاری اور ایذا رسانی کے ساتھ برباد نہ کرو۔"

ریا اور ایذا کے ساتھ صدقات کا ذکر فرما کر یہ ثابت کر دیا کہ صدقہ ریا اور ایذا، کی صورت میں بظاہر خیرات تو ہوتا ہے لیکن عند اللہ وہ نامقبول ہو جاتا ہے۔ ریا اس دکھاوے کا نام ہے جو صرف لوگوں کی خوشنودی پر محمول ہو اور اس میں خوفِ خدا کا قطعاً دخل نہ ہو اور صدقے کی ایذا یہ ہے کہ اہلِ حق کے علاوہ ان لوگوں کو دیا جائے یا کھلایا جائے جو اس کے مستحق نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ صدقہ خیرات چاہے، فرض ہو یا نفل۔ اس کے حقدار صرف غریب، مفلوک الحال اور محتاج لوگ ہی ہوتے ہیں۔ جو لوگ غیر محتاج ہوں۔

وہ صدقہ لینے کے عندالقرآن مجاز نہیں - اگر غیر محتاج لوگوں کو صدقہ دیا جائے تو یہ غریبوں کی حق تلفی ہے جس سے غریبوں کو ایذا پہنچتی ہے - اس واسطے غیر محتاج لوگوں کو صدقہ دینا ایذا میں شامل کیا گیا -

قرآن مجید کی تعلیمات، مساوات کو ان واضح راہوں پر چلانا چاہتی ہیں جہاں کوئی اذیّت، اخلاقی، روحانی، جسمانی، ظاہری اور باطنی طور پر کسی بھی طرح محتاج کا حق غصب نہ کر سکے - جو قوم یا ملک یا ممالک اس نظریے پر عمل پیرا ہوں وہاں کیونکر احتیاج باقی رہ سکتی ہے -

قرآن مجید اسلامی ریاستوں کو اسی طرح عمل پیرا ہو کر بنی نوع انسان کو اسلام کی طرف دعوت دیتا ہے تاکہ ساری انسانیت ایک ہی آئین کے تابع ہو کر رُوحانی، جسمانی آسودگی پاکر غیر محتاج ہو کر اللہ کی بندگی کریں اور شر و فساد کو دُنیا سے دُور کر کے امنِ عالم کا عَلَم بلند کریں -

قرآن مجید اور فلسفۂ جہاد

قرآن کریم کا نظریۂ جہاد کافر کا مہلک نہیں، بلکہ کافر کے افعالِ کافرانہ کے لیے مُہلک ہے۔ قرآن مجید کا نظریۂ حیات پوری انسانیت کے ساتھ حُسنِ سلوک کا روادار ہے اور پورے کا پورا قرآن پوری انسانیت کا احترام کرتا ہے۔

جہاد، جہد سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کوشش کرنے کے ہیں۔

قرآن مجید کی نظر میں ہر وہ کام جو اللہ کے لیے کیا جائے اور اللہ کی راہ میں رُوبعمل آئے، اس کو جہاد فی سبیل اللہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید ایسے صالحانہ انداز سے تجویز جہاد پیش کرتا ہے جو عدلِ فطری کے عین مطابق ہو۔ قرآن مجید ہر اس جارحیّت کی ممانعت کرتا ہے جو بلا وجہ انگیخت پر مبنی ہو۔ صداقتِ ذاتیہ سے کذب واقع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ صداقت کذب و اختراعاتِ کافرانہ کی ضد ہے۔

قانونِ قُدرت نے ہر چیز کو خیرِ محض کی صُورت میں پیدا فرمایا۔ اِس خیرِ محض کی سلامتی کے لیے اس کو ذاتی طور پر ایسی قوتیں تفویض فرما دیں جو اس کی بقاء و عافیّت کے لیے دفاع کا کام دیتی ہیں۔ یہی دفاع اس کے متضاد مہلکات سے نبرد آزما ہو کر جہاد بن جاتا ہے۔ پتھر کی سختی اس کے لیے دفاعی حیثیت ہے۔ پہاڑوں کی بلندیاں اور سختیاں ان کے لیے دفاعی فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ آسمان کی رفعتیں اپنی بقاء کے لیے دفاعی صلاحیّت رکھتی ہیں۔ ایک درخت کی شاخ اپنے اندر حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک لچک رکھتی ہے اور آندھیاں اور طوفان برداشت کرنے کے لیے اس میں وُہ فطری لچک ایسے خم و پیچ پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنے خم و پیچ سے بچاؤ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ آتش، آب، باد و خاک، سب میں قدرت نے اپنے دفاع کیلئے ایسی صلاحیتیں تفویض کر رکھی ہیں۔ حرارت، برُودت سے

اور برودت حرارت سے، اور ہوائیں رکاوٹ سے اور رُکاوٹیں ہواؤں سے، اور خاک قوّتِ ثقل سے اور ثقل لطافت سے ہمیشہ برسرِ پیکار ہو کر اپنا اپنا دفاع کرتے ہیں۔

اشیائے عالم کا باہمی تضاد ایک طرف اپنی نوعیت کی حفاظت اور دوسری طرف اپنی بقائے حیثیت کے لیے اپنی ہیئتِ مجموعہ پر استقامت پا کر اشیائے عالم کی صف میں اپنی تاریخ مرتب کرتا ہے۔ اس کی بقا، ہی اس کی تاریخ کی ضامن ہوتی ہے۔ اشیائے عالم میں سے جو چیز بھی اپنی دفاعی صلاحیتیں کھو بیٹھے، اسے ہلاکت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ قانونِ فطرت کے اسی اصُول پر حق و باطل کی تخلیق ہوئی۔ حق کے معنی سچائی کے ہیں اور باطل کے معنی جھوٹ کے ہیں۔ درحقیقت جھوٹ اس مہلک داستان کا نام ہے جو اچھائیوں کے لیے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہو اور سچّائی اس چیز کا نام ہے جو انسانوں کے راستوں سے ان مہلکات کو دُور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو جو انسانوں کی فطری صلاحیتوں کے لیے مہلک ہوں ہر سچائی ہر بُرائی کے لیے دافع ہے۔

انسانی دنیا میں دُو قسم کے دفاع ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں۔ ایک دفاعِ باطلانہ اور ایک دفاعِ حقّانہ۔ دفاعِ باطلانہ کی بنیادیں نفسانی غضب، نفسانی عصبیّت اور نفسانی ضِد پر مبنی ہوتی ہیں جو جارحیت سے نہیں بچ سکتیں اور دفاعِ حقانہ کی بنیاد ایمان باللہ پر ہوتی ہے جس کا آئین خدا کی مجوزہ صداقتوں پر مبنی ہوتا ہے اور خدا اپنی مخلوقات پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اُن سے ناروا سلوک کرنا اس کے ارادے میں آسکتا ہے۔ اس واسطے اہلِ حق کا دفاع آئینِ فطرت پر مبنی ہونے کی بنا پر کبھی جارح نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید جہاد کو بقائے صلح کے لیے پیش کرتا ہے اور اپنے مجاہد کو ہر میدان میں جدال سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔

اولادِ آدم نے ہمیشہ منفعتِ نفسانی کے لیے جدل و قتال کو جاری رکھا اور یہ ہوسِ نفسانی

کی پُرانی عادت چلی آئی ہے کہ وہ کسی دعوتِ حق کے بغیر محض آمرانہ حیثیت کو حاصل کرنے کے لیے جدال و قتال پر انسانوں کو آمادہ کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اگر آوازِ خداوندی عادل انبیاءؑ کے ذریعے دعوتِ حق کو نہ جاری کرتی تو شاید انسان ہمیشہ کے لیے درندہ ہو جاتا اور جدال و قتال کے ساتھ پھاڑنا، چیرنا، اور خون بہانا، لوگوں کو گھر سے بے گھر کرنا، اس کا دائمی مذہب ہو جاتا۔ مگر ایسے پیہم ظلم و عدوان کے زمانوں میں بار بار کلمۃ الحق کا بلند کرنا اور بار بار انسانیّت کو حق کے ضابطوں کا پابند کرنا، انسانیّت کی اس ظالمانہ عادت کو حق کے گُرز سے ضرب لگانا اس کی عادت کو حق کی طرف مائل کرنے کا ایک ذریعہ بنتا رہا۔

اس مسلسل عادتِ صالحانہ کی سب سے پہلی آواز، آوازِ حق تھی۔ جو خدا کے ساتھ متعلق ہو کر دُنیا میں آدم کی صُورت میں ثبوتِ نبوّت کے ساتھ نمودار ہوئی —— اور آدم نے اس آوازِ حق کو اپنی اولاد کے کانوں میں ڈالا۔ آپ کی اولاد میں ہابیل و قابیل کا واقعہ قرآن مجید بیان کرتا ہے۔ کہ یہ پہلا فساد حق و باطل کی جنگ کی صورت میں نمودار ہوا۔ ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو اپنی قوّتِ بدنیہ کے ساتھ مارنے کی دھمکی دے کر اسے مرعوب کرنے کی کوشش کی کیونکہ اس دھمکی سے اس کو منفعتِ نفس مقصود تھی۔

اس وقت اس فساد کا ذریعہ عورت بنی۔ نفس اپنی بنائے خواہش کے مطابق انتخابِ نکاح کے لیے یا انتخابِ زوجیّت کے لیے مشتغل ہوا۔ جس بھائی پر نفسانیّت غالب تھی۔ اس نے جارحیّت کے ساتھ حصُولِ مقصد کے لیے اپنی مدافعانہ صلاحیّت کو سامنے لانے کی کوشش کی۔ اور جس پر حق غالب تھا اس نے اس کو قاتلانہ جارحیّت کی مضرّات بیان کر کے اللہ کے غضب سے ڈرا کر ارتکابِ جرم سے بچانے کی پیہم کوشش کی اور اللہ کے نام سے اس کو صدائے بازگشت دیتا رہا۔ یہاں تک بھی اس نے اس کو ناحق قتل کرنے سے بچنے کی ترغیب دی کہ میں تجھ کو نہیں مارتا

اور میں اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں۔ اُس کو حق پر یقین تھا کہ حق حیات و موت دونوں میں یکساں طور پر منفعت بخش ہے اور اس کی جزائے خیر ملتی ہے اور ظلم حیات و موت دونوں میں نگاہِ حق کا معتوب ہے اور انجام کار وہ عتابِ الٰہی سے نہیں بچ سکتا۔

چنانچہ نفس کی باطل بنیادوں پر دفاع کرنے والے بھائی نے ظلم و عدوان کے ساتھ اپنے بے گناہ بھائی کو قتل کر کے جارحیت کی بنائے اوّل ڈال دی اور اولادِ آدم پر جارحیت کی راہ کھول دی اور دوسرے نے حق پر شہید ہو کر اپنے خونِ پاک سے حق کی آبیاری کی اور حق کی راہ کھول دی۔ اور اپنے مقدس خون سے لوحِ آدم پر لکھ دیا کہ ہمیشہ باطل کے سامنے اہلِ حق کو قربانیاں دینی پڑیں گی۔

ایثار و قربانی کی بنیاد ہی صلۂ رحمی کے ساتھ ہوتی ہے۔ حق نفع رسانی کی راہوں پر ڈالنے کے لیے آتا ہے اور ہر اس تدبیر کو اختیار کرتا ہے جو راہِ حق پر گامزن ہونے کے لیے ضروری ہو سکتی ہے۔ اس ضرورت میں سب سے پہلا کردارِ حق رحم و کرم ہوتا ہے۔ رحم و کرم کی جبلت عافیت طلب ہوتی ہے۔ مگر اس کے بعد رحم و کرم کے پاس ایک عادتِ رافت بھی ہوتی ہے۔ جو ماں اور باپ کی شفقت کے مشابہ ہوتی ہے۔ جیسے ایک ماں کے سامنے اس کا محبوب بیٹا سانپ سے کھیل رہا ہو یا کسی مہلک چیز کے ساتھ کھیل رہا ہو۔ ایسی حالت میں ماں کی رافت اس مہلک چیز سے بچانے کے لیے سختی کی صورت میں بچے کا دفاع نہیں کرتی بلکہ بچے پر آنے والی مہلک حالت کا دفاع کرتے ہوئے بچے پر جھپٹ پڑتی ہے۔ اگرچہ بظاہر اس پر غیظ و غضب کے آثار نمودار ہوتے ہیں، مگر بباطن اس کی یہ ساری کیفیت مرہونِ شفقت ہوتی ہے۔ اور وہ آگ سے، پانی سے اور حادثوں سے کھیل جاتی ہے۔ اس حالت میں معصوم بچہ روتا ہے۔ کیونکہ وہ مہلکات سے بے خبر ہے وہ اپنی نادانی کی

بنا پر ہر ایک ہلاکت انگیز واقعہ سے مانوس ہو کر طفلانہ دلچسپیوں کے ساتھ کھیلتا ہے اس کی یہ موانست اس کی طفولیت کا حصّہ ہوتی ہے اور یہی نادانی ماں کی رافت پر ناراض ہو کر رونا شروع کر دیتی ہے۔ ماں کے لیے بچّے کا چند منٹ کا رونا ناگوار ہو سکتا ہے۔ مگر بچے کی ہلاکت سخت ناگوار ہوتی ہے۔ یہ کردار حقیقی شفقت کا ایک حصّہ بن کر بچّے کے مصائب میں دفاع بنتا ہے اور یہ مادۂ رافت سنّت اللہ ہے۔

اللہ کی عادتِ کریمانہ رؤف و رحیم ہے۔ اللہ کی یہ سنّت ہر سچّے شفیق کے دِل میں موجود ہوتی ہے۔ اللہ کے بعد یہ عادت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السّلام میں پائی جاتی ہے۔ کہ وہ ہر اُس بُرائی سے بچانے کے لیے سربکف ہو جاتے ہیں جو کسی طرح بھی نوعِ انسانیت کے لیے مہلک ہو۔ اس کے بعد اولیاء اللہ میں یہ عادت نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے۔ چونکہ وہ اللہ و رسول ص کے حکم کی تعمیل میں متخلّق بہ اخلاق باللہ ہو جاتے ہیں۔ جملہ ماں باپ میں یہ عادت فطرت نے بہتات کے ساتھ ودیعت کر دی ہے۔ اور ہر خطرناک حالت میں ظہور پذیر ہو کر اپنے محبوبوں کے لیے دفاع کرتی ہے۔ تمام چرند، پرند، مرغ و ماہی میں بحالتِ مادر و پدر یہ شفقت کارفرما ہو کر جمال و جلال کی صُورت اختیار کرتی رہتی ہے۔ ہر شفیق کا جلال تقویتِ جمال کے لیے ہوتا ہے۔ اور ہر جلالِ شفقت پدری و مادری جمال اولاد کی تربیت کے لیے اپنے تمام عوامل ظاہریہ و باطنیہ کو شفقت و غضب کی صورت میں ظاہر کرنے کا عادی ہے۔ یہی تربیت و شفقتِ اسلامی حکمرانوں میں جلوہ گر ہو کر داخلی و خارجی برائیوں کا دفاع کرتی ہے۔

یہی عادت پروردگارِ عالم کے حضور سے آغاز کرتی ہُوئی، قانون کی صُورت میں ضوابط سے گزرتی ہوئی انسانوں کو راہِ راست پر لاتی رہی ہے۔ اور یہی عادت

ہمیشہ انسانوں کے لیے یکساں مفید رہی - قرآن مجید کا نظریۂ جہاد رافتِ خداوندی کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ جو نادان لوگ عزّت شخصی، عزّتِ مالی، عزّتِ اجتماعی، عزّت حکومت وسطوت کو بقائے حیات کا سامان سمجھ کر انصاف وعدل سے دُور رہ کر اپنی محبّت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں جس طرح ایک معصوم بچہ ماں باپ کی موجودگی میں آگ، سانپ، چاقو وغیرہ کو خوبصورت جان کر ان سے کھیل رہا ہو۔ بعینہٖ اہلِ دُنیا نفس کے موہوم حرص وہوا کا شکار ہو کر دنیا اور اُس کے جاہ ومال کو اپنا بنا کر ان سے کھیلتے ہیں۔ اور لاتعداد لوگوں کا حق غصب کرتے ہوئے اُن سے مانوس ہوتے ہیں۔ تو حق کی شفیق آنکھوں کے سامنے ان کی حالت سانپ سے کھیلنے والے بچّے کی مانند ہو جاتی ہے۔

جب بچّے کے ماں باپ جو اللہ کی مخلوق ہیں، اپنی حالتِ غضبیہ کو شفقت کی بناؤں پر بروئے کار لا کر بچّے کی ہلاکت کا دفاع کرتے ہیں، تو خدائے رحمان ورحیم جیسی شفیق ہستی انسانیّت کو ظلم وعدوان جیسے مہلک عفریت سے بچانے کے لیے اپنے قانونِ قدرت کے ساتھ اپنی جلالت کو کیوں کر اظہار میں نہ لائے۔ اس کی جلالت کا اظہار کہیں رعد وبرق کی صورت میں، کہیں ہولناک طوفانوں، آندھیوں، زلزلوں، قحط سالیوں، وباؤں کی صورت میں اور کہیں انسانی باہمی انقلابات کی صورت میں رُونما ہو کر ہلاکتوں سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے تاکہ عقلِ انسانی مافوق الادراک حادثات کے وُرُود سے خدا کی جلالت کا اندازہ کرتے ہوئے مہلکاتِ باطلہ سے بچ سکے اور مفہوم کر سکے کہ برائیوں سے بچانے کے لیے ہمیشہ جلالتِ شفیقانہ ہی صحیح دفاع ہو سکتی ہے۔

قرآنی نظریۂ جہاد کے خلاف جو دفاع بھی بروئے کار آئیں گے۔ اُن کی بنا

شفقت پر نہیں ہوگی، بلکہ اُن کی بنا ذاتی حرص و ہوا پر استوار ہو کر سراسر جارحیت بن جائے گی۔ چور، ڈاکو، رہزن، قاتل، فاسق و فاجر، سب کے سب نفسانی حرص و ہوا پر رہ کر ظلم اختیار کرتے ہیں۔ اگر سیاستِ انسانیہ میں ان جرائم پیشہ کی عادت آجائے تو انسانیت کی سب سے بڑی بدقسمتی کا ظہور ہوتا ہے۔

تہذیب اور شرافت کے جامہ میں اور امارت و غلبہ کی صورت میں وہ شفقت سے محروم ہو کر، انسانیت پر ظلم بن کر اپنی آمریت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ایسے اکابرین کی عادت غاصبانہ پوری دنیا کے لیے ذریعۂ معاصی بن جاتی ہے جب بھی ایسا معاشرہ ذرا سکون پائے گا۔ تو اس سے وہی معاصی سرزد ہونے شروع ہو جائیں گے جو اُن کے آمرانہ اکابرین نے اپنے لیے وجہ عُروج بنائے ہوئے تھے۔ عوام کے معصوم اذہان پر ایسی دلچسپ آمریت نقش کالحجر ہو جاتی ہے اور وہ عزتِ نفسی کے لیے انہی آمرانہ عادتوں کو اپنانے کے درپے ہو جاتے ہیں اور وہی چور، ڈاکو، قاتل، ظالم بھیڑیے، درندہ صفات لوگ ظلم کی راہوں پر تربیت پا کر عزت حاصل کرتے ہیں جس سے ناانصافی بار بار سامنے آتی ہے اور حق و صداقت کو پامال کرتی ہے۔

یہ طریقہ آگ اور زہرناک اژدہے سے کم نہیں ہوتا۔ درحقیقت اللہ کی تعلیمات اس کا نظریۂ جہاد گنہ گار کے لیے جاہد نہیں بلکہ گناہ کے لیے جاہد ہے۔

قرآن مجید کا نظریۂ جہاد کافر کا مہلک نہیں بلکہ کافرکے افعالِ کافرانہ کے لیے مہلک ہے۔ قرآن مجید کا نظریۂ حیات پوری انسانیت کے ساتھ حسن سلوک کا روادار ہے۔ اور پورے کا پورا قرآن انسانیت کا احترام کرتا ہے۔ وہ بھائیوں کو بھائیوں کے سامنے، بیٹوں کو ماؤں کے سامنے، اور بھائیوں کو بہنوں کے سامنے، اور بہنوں کو بھائیوں کے

سامنے مجروح، مذبوح اور مقتول کی حیثیت دینے سے قطعاً گریزاں ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ جہادِ فی سبیل اللہ میں مجاہد سے انسانی برادری کی بہنوں، بیٹیوں، ماؤں، ضعیف لوگوں، بیمار اور مجبور لوگوں کی عافیت کا عہد لیتے ہوئے جہاد کی تلقین کرتا ہے اور ناحق قدم جہاد بڑھانے سے سخت منع کرتا ہے اور جہاد میں پہل کرنے سے شدت کے ساتھ منع کرتا ہے۔ اور جہاد سے پہلے استقامتِ نفس پر سخت ضابطے کی تعلیم دیتا ہے اور نفسانی غیظ و غضب پر ضابطہ کرنے والے مجاہد کو جہادِ اکبر کا مجاہد قرار دیتا ہے۔ اور تلوار کے جہاد کو جہادِ اصغر سے تعبیر کرتا ہے۔

قرآن مجید کے نظریۂ جہاد میں ذاتی غیظ و غضب پر سبقت لے جانے کا نام جہادِ اکبر ہے۔ جو مجاہد خوفِ الٰہی سے اپنے نفسیات پر قابو نہیں پا سکتا۔ اس کو تلوار کے ساتھ اور نوکِ خنجر کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں مل سکتی اور وہ جہادِ اصغر کے میدان میں نکلنے کا مجاز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خنجر اور نوکِ خنجر یا اسلحۂ حرب سب کے سب کسی کی جانِ عزیز کا خون بہا سکتے ہیں اور جس کا خون بہایا جاتا ہے وہ کسی کی امیدوں کا سہارا ہوتا ہے۔ اسلام کسی کی امیدوں کو پامال کرنے کے لیے نہیں آیا، بلکہ وہ پروردگارِ عالم کی طرف سے عالمِ مجاز میں انسانی امیدوں کی آبیاری کرنے کے لیے آیا ہے۔

وہ چمنِ انسانی کا باغبان بن کر آیا ہے۔ باغبان قاتلِ چمن نہیں ہو سکتا۔ البتہ باغبان کی ایک حالت یہ ہوتی ہے کہ جب باغ کے اشجار بیمار ہو جائیں یا وہ اتنے بے ہنگم طور پر پھیل جائیں کہ اُن کی ذاتی نشوونما دوسرے اشجار کے پھلنے پھولنے میں رکاوٹ کا باعث ہو جائے تو وہ شاخ تراشی کرتا ہے۔ یہ شاخ تراشی بظاہر سخت معلوم ہوتی ہے مگر اصولی اور معنوی طور پر اس میں دانش باغبان اپنی شفقتِ اصلیہ کی بنا پر شاخ تراشی کرتی ہے تاکہ

اشجار صحیح منہج پر آکر پھلیں اور پھولیں ۔ اور منفعت عامہ کا باعث بنیں ۔ قدرت بھی بعض ذہنیت انسانی بے ہنگم پھیلاؤ کو روکنے کے لیے گاہے گاہے انسانی شاخ تراشی کرتی ہے ۔

بظاہر یہ ہولناک منظر ہوتا ہے مگر اصولی معنوں میں انسانیت کو صحتمندانہ طریقے پر بارآور ہونے کا قدرتی طور پر موقع دیا جاتا ہے ۔ بعض دفعہ حادثات غیر انقلابی صورت میں ارضی و سماوی حادثات بن کر رونما ہوتے ہیں ۔ اور یہ حادثات عین اس وقت ظہور پذیر ہوتے ہیں ۔ جب انسان کی رحم و کرم ، عدل و انصاف خدمت انسانیت اور اظہار صداقت کی صلاحیتیں مفقود ہو جائیں اور وہ محض جنگل کے ان درختوں کی طرح ہو جائے جو ذاتی منفعت کے لیے ارض و سما سے فائدہ اٹھا رہے ہوں مگر دوسروں کے لیے پھل پھول کی صورت میں منافع بخش نہ ہوں اور ان کو کاٹ دیا جائے تاکہ نئے اشجار پیدا ہو کر نئی زندگانیوں کے ساتھ انسانیت کیلئے منفعت بخش ثابت ہوں ۔

بالکل اسی طرح جب انسان صرف نفس کے ہاتھوں سعادتوں سے محروم ہو جاتا ہے اور اس سے نیکیوں کا پھل پیدا ہونا بند ہو جاتا ہے وہ سراسر برائیوں کا پیکر بن جاتا ہے ۔ اس کی برائیاں شرقین و غربین پھیل جاتی ہیں اور ساری انسانیت ان برائیوں کی لپیٹ میں آجاتی ہے تو یہ جملہ آفات اس کو سمجھانے کے لیے براہینِ ربانی کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں :-

جہاندار داند جہاں داشتن
کسے را بریدن کسے کاشتن

قرآن مجید کی اسلامی تعلیمات اپنے مجاہدین کو اللہ کے نام سے جو رؤف و رحیم ہے ۔ کوشش ادا کرنے کی تلقین کرتی ہیں تاکہ وہ راہِ جہاد میں کسی وقت ، کسی لمحہ نفس

کا شکار نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ ہر مجاہد:۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے ساتھ جہادِ فی سبیل اللہ کا آغاز کرتا ہے۔

"یعنی میں اللہ کے ساتھ اور اس کی معیّت میں نفس وشیطان کی ہر برائی سے پناہ مانگتا ہوں اور اللہ ہی کے نام سے ہر کوشش کا آغاز کرتا ہوں۔"

اس کے بعد اس کو طہارتِ بدنی حاصل کرنے کا حکم ملتا ہے۔ طہارتِ ظاہری اور طہارتِ بدنی کے ساتھ اسے آوازِ حق بلند کرنے کا حکم ملتا ہے۔ چونکہ ہر ناپاکی برائی میں داخل ہے اس لیے اسلامی تعلیمات اس کو غلاظتوں سے جہاد کرنے کا حکم دیتی ہیں کہ وہ سب سے پہلے اپنی ذاتی برائیوں کا استیصال کرے۔ پھر دوسرے کی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ قرآنی تعلیمات کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنی ذاتی برائیوں کے ساتھ جہاد نہیں کرسکتا۔ وہ دوسرے کی برائیوں کو دور کرنے کا حق بھی نہیں رکھتا۔

قرآن مجید کی یہ فطری تعلیم حق و صداقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ وہی شخص دوسرے کی برائیوں کو دور کرنے کا حق رکھتا ہے جو اپنی برائیوں کے ساتھ جنگ کرسکے۔ جس کی اپنی ذات، اپنا گھرانہ اور اپنا ماحول برائیوں سے پٹا پڑا ہو وہ دوسروں کی برائیوں کو کیوں کر دور کرسکتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات میں جہاد ایک طرزِ تبلیغ ہے۔ قرآن مجید نے اس کی بہت سی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ جنہیں جہادِ بالنفس، جہادِ بالمال، جہادِ بالاولاد، جہادِ بالعائلہ وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِکَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَاءُ بَعْضٍ ط

"یعنی جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا اپنے مال اور جانوں کے ساتھ راہ خدا میں اور وہ ایماندار جنہوں نے مہاجرین کی تائید کی۔ ایسے ایمان دار ایمان داروں کے رفیق ہیں۔" اس آیت میں جہادِ ترکِ وطن کے ساتھ اور جہادِ بالمال جہادِ بالنفس کی صورت میں مہاجرین کی تائید کی صورت میں بیان کیا گیا۔ ترکِ وطن، جہادِ بالمال، جہادِ بالنفس جہادِ بالاعانت سب کے سب نفسیات کے خلاف ہیں۔

دوسری جگہ اللہ کی راہ میں ترکِ وطن کرنے والے مال و جان سے جہاد کرنے والے مومنوں کو اللہ کے نزدیک بہت بڑے درجے والا قرار دیا گیا۔ تیسری جگہ ایسے مجاہدین کو اُولٰئِکَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ فرمایا یعنی یہی لوگ فائز المرام ہیں۔ چوتھے مقام پر ایسے مجاہدین کو

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ

"یعنی ان کو ان کے پروردگار کی طرف سے رحمت اور رضامندی کی خوشخبری دی گئی ہے۔" پانچویں مقام پر ایسے مجاہدین کے لیے فرمایا: اُولٰئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا: یہی لوگ سچے ایمان والے ہیں اور فرمایا: لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ط

ایسے ہی لوگوں کے لیے مغفرت اور رزقِ پاک کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اس قسم کی قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد اللہ کی راہ میں ہر اس نیکی کا حاصل کرنا ہے جو اپنے لیے اور دوسروں کے لیے نجات کا باعث ہو۔ قرآن مجید میں جس مقام پر جہاد کو جنگ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہاں منکرینِ حق کو اپنے دفاع سے ترہیب دے کر اللہ اور اس کی صداقتوں کے سامنے سجدہ ریز کرنا مراد ہے۔ آیاتِ جہاد میں جو جنگ کے لیے آئی ہیں قطعاً نفسانی مفاد کے لیے نہیں۔

اگر ایسے جنگ کو نفسانی مفاد پر مرتب کیا جائے تو عند القرآن ایسا جنگ مسلمانوں

پر حرام ہے۔ ایسی نفسیاتی لڑائی جس میں احیائے حق نہ ہو۔ اسلام میں سِرے سے اس کا وجود ہی نہیں ملتا۔ اس طرح مارے جانے والے شہید نہیں بلکہ مقتولِ محض ہوں گے۔ اس طرح لوگوں کو مارنے والے ظالم' جارح، غاصب، ناحق خون بہانے والے گردانے جاتے ہیں۔

اسلام، خونِ انسانیت کا حقیقی امین ہے جو کسی مسلم یا غیر مسلم کے ناحق خون بہنے پر اپنی عدالت میں مقدمہ کرتا ہے۔ اور اپنوں پرایوں سے اس کا بدلہ لیتا ہے۔ خُون بہا کا دستور اسلام نے پیش کیا۔ فدیہ جزیہ' غیر مسلم کو ریاست میں امن عامہ سے رکھنا، قیدیوں سے بیگار نہ لینا، بلاوجہ کسی کو نہ مارنا، پہل نہ کرنا وغیرہ اسلامی جہاد کے صلح جو ہونے کی دلیلِ عظیم ہے۔

قرآن کے اسلامی جہاد کا حتمی اقدام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور ان کے صحابہؓ نے کیا۔ تاریخ عیسوی سے اس دور تک جس میں رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم قرآن مجید کی بعثت میں مبعوث ہوئے اس وقت جہالتِ انسانیہ جس بربریت کے خوفناک حالات سے دوچار تھی وہ من وعن تاریخ اسلام اور تاریخ عرب میں موجود ہے۔ ناانصافی، بہیمیت' بے حیائی، جذبات کشی اور خون ریزی کی وہ عشوہ طرازیاں تھیں جن کو چشم فلک بھی دیکھتے ہوئے شرماتی تھی۔ گویا اولادِ آدم میں ماضی کی تمام برائیاں سمٹ کر ریگ زارِ عرب کے سینے پر جمع ہوگئی تھیں جن کا مرکزی مقام مکہ تھا۔

جہاں لاتعداد بُت انسانی جبینوں کو جھکانے کے لیے آویزاں کیے گئے تھے۔ ماضی کی وہ تعلیمات جو ان کے ورثہ میں آئی تھیں اور انبیائے کرام علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے ان کو ذہن نشین کرایا تھا۔ وہ سب عیش وطرب کے ہاتھوں ہر بار زار پامال کر دی گئیں۔ عفتِ انسانیت

سربازار لُٹ رہی تھی اور رحم وکرم کا نام ونشان تک ان کے چہروں سے میسّر نہیں آسکتا تھا۔ ظلم وعدوان کی ایسی حکومت تھی کہ کسی شریف کو کلمۂ شرافت ادا کرنے کی جسارت نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر ظُلم بالائے ظُلم یہ تھا کہ اپنے ننگِ انسانیت کردار پران کا اترانا اور غرورِ نفس کا شکار ہونا خدا اور اس کے رسُولؐ کا استہزاء اور نیکیوں کو سخت کرخت نگاہوں سے دیکھنا وغیرہ مظاہرات فطرت کو اتنے ناگوار گزرے کہ ظلم وعدوان کی ان طویل راتوں کو ختم کرانے کے لیے ایک آفتابِ عالمتاب کے طلُوع کرنے کی صورت پیدا ہو گئی۔

خداوندِ کریم کی یہ قدیم عادت ہے کہ زمانے کی انسانی تاریکیوں کو دُور کرنے کے لیے ہدایت کے آفتاب طلُوع کرتا رہا۔ اس عادتِ کریمہ سے اس نے اس آخری بگڑی ہوئی صورت کو درست کرنے کے لیے اپنے آخری نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھیجا اور ان کے ہاتھ میں کتابِ مبین دی تاکہ وہ اپنی شفقتِ عظیمہ سے اپنے مرسلانہ جلال وجمال کے ساتھ جلالِ خداوندی کا اسی کتاب کی زبان سے ترجمہ کریں اور اپنی آخری رافت کے ساتھ ان کو شفیق ماں کی طرح شفیقانہ تیوروں کے ساتھ اور شفیقانہ تبسّم کے ساتھ غلطیوں کا احساس دِلوا کر نیکیوں کی طرف بلائیں۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:-

یَا اَیُّہَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ ۵

یعنی "اے کملی پوش، سرورِ کائنات! اُٹھ اور ان لوگوں کو ڈرا اور پاک صاف اور دِل نشیں لباس پہن اور ہر قسم کی غلاظتوں سے الگ ہو جا۔"

ان آیات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو عرب کے بدحال لوگوں کو راہِ راست

پر لانے کے لیے ڈرانے کا وہی طریقہ بتایا جو خُدا اپنے بندوں سے اختیار کرتا ہے اور شفیق مائیں یا شفیق باپ اپنے بچوں سے اختیار کرتے ہیں۔ ترہیب کا یہ مشفقانہ سلسلہ دربگ فکبرّ سے ہوتا ہے کہ تو ان کو سب سے بڑے خدا کے نام سے ڈرا۔ یعنی خُدا کی بڑائی بیان کر۔ پھر وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ خوش نما پوشاک کا اس تبلیغ کے ساتھ ملحق ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہ لوگ نفس کے دیوانے اور لباس سے بھی بے خبر رہ کر برہنہ ہو چکے تھے۔ یا بصورتِ دیگر طہارتِ ظاہریہ سے محروم ہو چکے تھے۔

جہاں ان کی باطنی تہذیب برباد ہو چکی تھی وہاں ان کی ظاہری تہذیب بھی بربادیوں کا سامنا کر رہی تھی۔ اور چوتھے مقام پر "وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ" فرما کر غلاظت سے اجتناب کا حکم دیا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معیشت کی تباہی مول لے چکے تھے۔ ان کا طرز و اطوار، رہنا سہنا، ان کے لباس، ان کے وجود، ان کے گلی کوچے اور ان کے شہر و بازار غلاظت کا شکار ہو چکے تھے۔

ہدایت صرف زبان ہی سے نہیں ہوتی بلکہ اشارات، کنایات، حرکات، سکنات، ہجرت، طہارت، لباس کی پاکیزگی، رہنے سہنے، اُٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے اور پاکیزہ ماحول کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہر شفیق اپنے عزیزوں کو سمجھانے کے لیے جو طریقے اختیار کرتا ہے۔ وہ سب برائیوں کو دُور کرنے کے لیے جہاد کا حکم رکھتے ہیں۔ قانونِ فطرت نے ہمیشہ ترغیب کے لیے حسین و جمیل صُورتوں کے ساتھ نیکیوں کی طرف بلایا اور سخت خوفناک حالتوں میں سخت جلال کی صورت میں برائیوں سے بچانے کے لیے ترہیب کی صورت اختیار کی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بچپن سے بعثت تک امین ہونا برائیوں کی مدافعت کے لیے نبوّت کا پیش خیمہ ہے اور آپؐ کی نبوّت نے اسی پیش خیمہ پر لوگوں کو بلایا اور ان میں رسالت

کا دعویٰ کیا۔ یہ آوازِ حق فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوئی اور انسانی عادت کے مطابق ان کی فکروں سے جہاد کیا اور اس جہاد کی ترتیب یوں رکھی کہ آپؐ نے بلند کوہ پر بیٹھ کر فرمایا کہ :-

" اے لوگو ! اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے غنیم ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم میری اس بات کو تسلیم کرو گے ؟ "

یہ دعوت صداقت پر مبنی تھی چونکہ جو بلندی پر ہوتا ہے۔ اس کے سامنے نشیب و فراز ہوتے ہیں اور دوسرے جہاد کی ترجمانی اسی کا حق ہوتا ہے۔ آپؐ بظاہر مادّی دنیا میں پہاڑی کی چوٹی پر تھے جو بلندی و ترجمانی کی علامت ہے۔ مگر آپؐ عالمِ معنویت میں شدّ و مدّ سے اس بلندی پر فائز تھے جس کو پروردگارِ عالم نے ختمی بلندی کہا۔ عالمِ دنیا کی بلندیوں سے اوجھل رہنے والی باتوں کی ترجمانی سوائے بلندئ نبوّت کے نہیں ہو سکتی۔

عالمِ معنویت کی نامعلوم دنیاؤں کی خبر بھی بغیر ختمی بلندی کے میسّر نہیں آ سکتی۔ اس تمثیل کی ضرورت حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو تسلیم و رضا کے لیے درپیش آئی۔ چونکہ آپؐ نبوّت کی بلندی کا اظہار کرنے والے تھے اور اس کے عوالم کی نامعلوم اخبار کے ساتھ دعویٰ نبوّت کرنے والے تھے جس کی شہادت کے لیے تمثیلاً مجازاً ایک ایسی دلیل سے منکرین کے اذہان کو قبل از دعویٰ میدانِ تسلیم میں لے آئے۔ کہ جس دلیل کی بعد از دعویٰ کی ضرورت درپیش آ سکتی تھی۔ عقول کو فسادِ دلیل میں ڈالنے سے پہلے فسادِ عقل کا فیصلہ کیا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے اس سوال کے بعد سب نے اتفاقِ رائے سے آواز بلند کی کہ آپؐ بچپن سے صادق و امین ہیں۔ اس واسطے ہم آپؐ کی بات کو ضرور تسلیم کریں گے اور اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تم میرے صادق و امین ہونے کے معتقد ہو اور مجھ

پر یقین رکھتے ہو تو میں تمہیں کہتا ہوں کہ میں اللہ کی طرف سے تم پر نبیؐ بنا کر بھیجا گیا ہوں تم مجھے اللہ کا نبی تسلیم کرو اور حق کی طرف آجاؤ۔

یہ صحت مندانہ فکری جہاد تھا جو میدانِ عمل میں کیا گیا۔ حق آگیا اور باطل لرزہ براندام ہوگیا۔ قلوب و عقول میں کھلبلی مچ گئی۔ یہی کھلبلی حق و صداقت کا باطل کیسانھ جہاد تھا۔ یہی زلزلہ تھا۔ جس نے بعد میں انسانی صلاحیتوں کو باطلانہ اذہان سے باہر نکالا اور راہِ حق دکھایا اس کے بعد کچھ وقت تک باطل جمع ہو کر آپؐ سے برسرِ پیکار رہا اور آپؐ بطلانِ انسانیت سے شفیقانہ جہاد کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ترکِ وطن کے ساتھ جہاد کا زمانہ آپہنچا۔

اپنے محبوب ترین وطن مالوف کو حق و صداقت کے احیاء کے لیے چھوڑنے پر آمادۂ کار ہوئے چند نفوس جنہوں نے صدائے حق قبول کرنے کے بعد جادۂ حق پر قدم رکھا تھا وہ بھی آپؐ کے ساتھ ترک وطن پر تیار ہوگئے۔ ترک وطن کی صعوبتوں کے ساتھ یہ قافلہ میدانِ بدر میں پہنچا۔ جہاں جنگ کی صورت میں جہاد کی تشکیل فرمائی۔ تین سو تیرہ ۳۱۳ نہتے مسافر وں مہاجروں اور بے وطن لوگوں نے ایک ہزار آراستہ و پیراستہ مسلح فوجِ باطل سے نبرد آزما ہو کر حق و صداقت کا فاتحانہ علم بلند کیا۔ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام فاتحین کی معیّت میں جب مکّہ معظمہ میں داخل ہوئے تو شفقت کریمانہ کا جنگ کے بعد اس طرح عملی ترجمہ فرماتے ہیں کہ جب دشمنانِ اسلام مجرم کی صورت میں آپؐ کے سامنے پیش کیے گئے تو آپؐ نے شفقتِ خداوندی اور شفقتِ والدین کی صورتیں اپنی رافت کریمانہ کا ایسے الفاظِ مقدس کے ساتھ مظاہرہ فرمایا۔

برسرِ عدالت حقہ فرمانِ مصطفویؐ۔ بظاہر ایک مجلس کے سامنے مگر معانی میں ساری کائنات کے لیے اس طرح گونجا۔ ارشاد ہوا:۔ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط۔

یعنی شفیق خدائے برتر کے شفیق بندۂ فاتح کی عدالتِ خداوندی کی موجودگی میں

جب کہ قوّت حاکمہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اے مجرمو! جُرم کے انتہا پسندو! آج تم میں سے کسی پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ جاؤ، تم کو معاف کیا جاتا ہے۔ قافلۂ رسولؐ کی محبوب ترین شخصیات کو موت کے گھاٹ اتارنے والوں، ان کا کلیجہ چبا کر کھانے والوں کو مشفق آنکھوں نے پا کر چھوڑ دیا۔ یہ واقعہ شفقتِ مادرانہ سے کس طرح کم ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر قرآن مجید کا جنگی نظامِ جہاد جہادِ حق کی جو ترجمانی کرتا ہے، مسلمانوں کے لیے میدانِ جہاد میں اسی پر اس کی بنا رکھی گئی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی زندگی میں اپنے پیروکاروں کے ساتھ جو غزوات انجام دیے۔ وہ جنگ، اصولِ حق کی بنا، پر استیصالِ باطل کے لیے تھی۔ نہ کہ مدافعتِ انسانیت کے لیے بروئے کار آئے تھے۔ افعالِ قبیحہ انسانی عادات سے متعلق ہو کر انسان کی بداخلاقیاں بنتے ہیں۔ اگر مخالفینِ اسلام جنگ کرنے سے باز آجائیں تو بلا ہلاکت قرآن مجید کا اسلام انہیں امان دیتا ہے اور قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ اہلِ کفر جنگ میں صُلح کے لیے ہاتھ بڑھائیں، تو ان کے ساتھ صلح کر لو۔ صرف ان حالتوں میں جب وہ اپنے وعدوں سے ہٹ جائیں، ان کے ساتھ جہاد کرو، تاکہ وہ غلط بیانی سے عوام کو دھوکہ نہ دے سکیں۔ اس حالت پر قرآن مجید اس طرح ارشاد فرماتا ہے :-

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ؕ

یعنی اگر وہ اپنے عہدِ صلح سے ہٹ جائیں اور تمہارے دین پر طعنہ بازی شروع کر دیں۔ ایسی حالت میں ان کے رہنماؤں کے ساتھ جو کافروں کو باطلانہ طور پر عہد شکنی پر آمادہ کرتے ہیں۔ لڑائی کرو، اس واسطے کہ ایسے باطل پسند لوگوں کا کوئی عہد نہیں ہوتا۔ اُن سے

ایسی لڑائی کرو کہ وہ افعال کافرانہ سے باز آجائیں۔ پھر فرمایا کہ جب تک وہ جنگ میں پہل نہ کریں تم ان سے جنگ نہ کرو، مگر ان کے عہد ناموں پر بھی یقین نہ کرو اور ان کی بدعہدی سے خبردار رہو کہ وہ کبھی عہد پر ثابت قدم رہنے والے نہیں۔

اس طرح قرآن مجید کا جہاد جنگ کے میدان میں اخلاقی نوعیت اختیار کر لیتا ہے اور اس اخلاقی نوعیت کو اسلامی دفاع کہا گیا ہے۔ جذباتِ انسانی کے احترام کے بعد انہیں ترہیب و ترغیب کے لیے راہِ راست کی طرف دعوت پر آمادہ کرنے کے لیے قرآن مجید صُلح و جنگ دونوں کو اخلاقی صُورت دے کر دعوتِ حق دیتا ہے۔ مگر اس جنگ کی تدابیر حاصل کرنے کے لیے جہاد کرنے کی سخت تاکید کرتا ہے اور بغیر تربیّت کے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت نہیں دیتا اور حالتِ جنگ میں منکرینِ حق کے ان دعووں کے مقابلے میں جن سے وہ اپنی برتری کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ وہ کمزور نہیں ہیں، بلکہ طاقت میں تم سے بڑھ چڑھ کر ہیں اور ان کے اس دعوے کے مقابلے میں کہ وہ اپنے باطل سے حق کو مٹانے کے لیے پورے ساز و سامان کے ساتھ تیار ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ط یعنی ان مدعیانِ باطل کے لاف و گزاف کے ردِّعمل کے لیے تم امکانی وسائل کے ساتھ میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تربیّت یافتہ گھوڑوں کے ساتھ اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو ڈرانے کے لیے کہ وہ حق کو شکست نہ دے سکیں اور اس کے علاوہ جملہ دشمنانِ اسلام کے لیے یہ تیاری کرو، جس کو تم نہیں جانتے۔ مگر وہ چھپے رہ کر تم کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ ان کو اللہ جانتا ہے۔

اس آیت میں پورے وسائل کے ساتھ جنگ کرنے کے حکم سے ہر زمانے کے مطابق سامانِ حرب وضرب کے حاصل کرنے کی تعلیم قرآن مجید سے ثابت ہو جاتی ہے۔ جس میں ایک چھوٹے سے ہتھیار اور ایک ذی جان سواری سے لے کر تمام بری و بحری سواریوں کا ثبوت میسّر آتا ہے جن کے ساتھ جنگ لڑی جا سکتی ہے اور تمام فضائی طیاروں جنگی جہازوں ہائیڈروجن بم، ایٹم بم اور راکٹوں کا ثبوت بھی میسّر آجاتا ہے جو انسانی گرفت میں آکر میدانِ جنگ میں کام کر سکتے ہیں۔

اس حکم خداوندی کے بعد ان جملہ سامانوں کو جنگ کے لیے حاصل نہ کرنا مسلمانانِ عالم کے لیے نافرمانی کی حیثیت رکھتا ہے اگر وہ امکانی استطاعت کے ساتھ جس میں علم و ہنر اور صنعت و حرفت سب داخل ہیں حاصل نہ کریں تو اعراض عن الحکم ہو گا۔ ایسی جنگ لڑنے والے مسلمانوں کو تیار کرنے کے لیے براہِ راست سرورِ کائنات، فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلّم کو حکم دیا جاتا ہے۔

یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ۔

"یعنی اے نبی کریم علیک السّلام مومنوں کو منکرین کے ساتھ جہاد کے لیے تیار فرمائیے اگر صاحبِ استقامت دس مومن تم میں سے ہوں گے تو وہ سَو پر غالب آئیں گے۔ اور اگر تم میں سے ایسے سو مومن ہوں گے تو وہ ایک ہزار پر غالب آئینگے۔ ان لوگوں پر جو کافروں سے ہیں کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو ناسمجھ ہیں۔"

اس کے بعد مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور وہ پہلی سی استقامت حصولِ تربیت کے زمانوں میں

تربیّت حاصل کرنے تک نہ رہی تھی تو اس حُکم کو اس طرح بدل دیا گیا تھا کہ تربیّت حاصل کرنے کے بغیر پہلے لوگوں کی طرح استقامت حاصل کرنے کے بغیر تم میں سے سو آدمی دو سو پر غالب آئے گا اور ایک ہزار دو ہزار پر غالب آئے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلی عادت منسُوخ ہو گئی بلکہ اس سے تربیّتِ کمال مُراد ہے۔

بعد کی جنگ میں خالد ابن ولیدؓ نے پہلے تناسب کو ثابت کر دیا اور بھارت سے ستمبر ۶۵ء میں ہماری پاکستان کی لڑائی نے بھی اعلیٰ قیادت کے ساتھ اس تناسبِ اوّل کو ثابت کر دیا کہ دس سو پر ایک سو غالب آئے۔

یہ ساری تیاّریٔ جنگ مومن کو حسنِ باطن کے ساتھ اپنی داخلی خرابیوں کے ساتھ جنگ کرنے سے لے کر خارج کی بد اخلاقیوں کی مدافعت کے لیے قرآن مجید کے بہت سے ایسے احکام ترتیبِ جنگ پر اس انداز سے تبصرہ کرتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی جنگ جارحیّت سے مبرّا ہے اور اس پر احتیاط برتنے کا بار بار حکم دیا گیا ہے۔

اسلام میں قتلِ انسان جیسا بڑا جرم بعد از شرک اور کوئی نہیں ہے۔ جہاد کی اس تشریح کے مطابق ان اسلامی جنگوں کو جو ظاہری رسموں کے ساتھ لڑی گئی ہیں مگر ان میں جارحیّت تھی۔ قرآن مجید کا اسلام ان کی رواداری نہیں کرتا۔ جس مسلمان نے خلافِ قرآن خلافِ اسلام خلافِ نبیٔ آخر الزّماںؐ جنگ میں جارحانہ صورت اختیار کی۔ اس کو اللہ کے سامنے اپنے ظلم کا بدلہ دینا ہوگا۔ کوئی مسلمان اسلام کے نام سے جارحانہ جنگ لڑ کر اللہ کی باز پرس سے بچ نہیں سکتا۔ مگر اسلام کی جنگ کا اختتام صلح و امن پر ہوتا ہے۔ صلح سے اُٹھ کر صلح کے میدان میں رُکتا ہے۔

قرآن مجید کی انقلاب انگیزی

قرآن مجید کی جملہ تعلیمات صاحبِ ایمان کو ایمان سے ابتدا
کرنے کی اس واسطے تاکید کرتی ہیں کہ جسمِ ثقیل کے ذرّے ذرّے
پر صرف رُوحانیت ہی کارفرما ہے۔ ورنہ وہ بے کار مُردہ
کی حیثیت رکھتا ہے اس کی جملہ حرکات وسکنات
رُوح پر مرتب ہوتی ہیں

قرآن مجید اپنے حرفِ اوّل سے لے کر حرفِ آخر تک ایک اعجازِ عظیم ہے۔ قرآن مجید کا انقلاب انگیز نزول عالمِ فطرت میں ایک ایسے عظیم معجزے کی صورت میں نمودار ہوا۔ جس کی اعجاز انگیزی عقول کے سامنے حتمی دلائل کے ساتھ اور سندِ ربّانی ہونے کے ساتھ انسانیّت کی راہنمائی کے لیے ایک ایسے نازک ترین دور میں انسانیت کے سامنے پیش کی گئی جب انسان ایسے تاریخی حالات سے گزر چکا تھا جن میں انسانیت کا ماضی بار بار فطری ہدایات پانے کے بعد گمراہی کا شکار ہو کر اپنی عادتِ انسانیہ سے اتنا مجبور ہو چکا تھا کہ سلاسلِ نفس اور سلاسلِ شیطنیّت سے آزادی حاصل کرنا اس کے ضابطۂ عمل سے باہر تھا۔

جب انسانیّت ایک عادت کو اپنا ثانیہ بنا لیتی ہے تو معاشرہ اس مجموعی عادت کی لپیٹ میں آ کر اسی عادتِ مذمومہ کو اپنا مذہب سمجھ لیتی ہے۔ ہمیشہ انسانیّت اسی عادتِ نفسانیہ کا شکار ہو کر راہِ حق سے بھٹکتی رہی، اپنے فطری امن و عافیت کو خواہشات اور لذّات کی بھینٹ چڑھاتی رہی اور تدریجاً نوعِ انسانیت کو متاثر کرتی رہی۔ ان تاثرات نے ایک طرف اپنے تہذیب و تمدّنِ انسانیہ کو فطرت کی بناؤں پر تعمیر نہ ہونے دیا اور دوسری طرف روحانیّت کی اس جمیل ترین صورت کو بگاڑتی رہیں جو اَنفُس و آفاق، کو عبور کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

جس روحانیت کی ذمہ داری فکر و نظر اور عالمِ ہست و بود سے گزر کر حقیقتِ حقہ

تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ وہ نفس کے موہوم اور مخترع خیالات کا شکار ہو کر دنیا کی اس پستی میں کھو جاتی رہی جس کا درجہ عمومیتِ انسانیہ سے گزر کر بہیمیت کی صورت اختیار کرتا رہا۔

انبیاء کی مختلف بستیوں اور شہروں میں بالتکرار بعثت اور ان کا جائزہ اور اُن کی تبلیغ صحف سماویہ کی صورت میں شاہد ہے کہ انسان بار بار اس طرح گمراہی اختیار کرتا رہا کہ وہ حیوانیت سے متاثر ہو کر انسانیت کی تذلیل کرنے لگا۔

قرآن مجید نے ایسے حالات اختیار کرنے والے انسانوں کو کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ کے ساتھ تعبیر کیا ہے جو صورت جسمانی، صورت رُوحانی، صورتِ عقلی، صُورتِ علمی صُورتِ فنّی، صورت اخلاقی، صُورتِ تہذیب اور صُورتِ تمدّن ایسے اذہان کا شکار ہونے کے بعد گمراہی کی ایک جیتی جاگتی صورت بن جایا کرتے ہیں۔ چونکہ انسان زمین پر ہر حالت میں متصرف رہا ہے۔ اگرچہ اس کا تصرّف منقطع حیثیت میں متفرق تھا اور تالیف و یگانگت سے بالکل جُدا تھا۔ پھر بھی کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ کے ضمن میں وہ جبلتہً مدنی الخیال رہا ہے۔

چنانچہ اس فطری اصُول نے اس کو قریہ بہ قریہ اور ٹولی ٹولی کی صُورت میں سیادت کرنے کا جذبہ دیا۔ یہ سیادت ایسے حالات میں اس قدر مسموم ثابت ہوتی رہی جس سے انسانی صلاحیتیں ہمیشہ سر بازار پامال ہوتی رہیں۔ عوام النّاس کی صلاحیتوں کو ہمیشہ ان سیادتوں کی بھینٹ چڑھنا پڑا اور وہ عشرت خانۂ سیادت کا شکار ہوتی رہیں۔ گویا یہ غیر مہذّب سیادتیں انسانی جسم و جان کا مقتل تھیں۔

فطرت کی آنکھ بار بار انسانیت کی اس بربریت کا نہایت صبر و حلم کے ساتھ مطالعہ کرتی رہی۔ ابنائے انسان کو حالات کے ساتھ بدلنے کا موقع دیتی رہی اور حالات کے

ساتھ وسائل بھی مہیّا کرتی رہی۔

کارسازِ فطرت نے انسانی فکر کو انسان کا ہادی بنایا۔ ہر فرد پر اس فکرِ انسانیہ کی ذمّہ داری ہوتی ہے کہ وہ استدلال کے سامنے اپنی فطری ہدایت کے ساتھ ہتھیار ڈال دے۔ اس نظرّیہ کو بربریت پسند انسانوں نے بھی ہمیشہ تسلیم کیا، مگر بکمال آئینِ فطرت نہ ملنے کی بناء پر اذہان کی سخت حقائق کے سامنے سربسجود نہ ہوسکی۔ انسانی اذہان کے مطالبات ان کی عملی صورت میں تاریخ انسانیت کے ذریعے آج بھی ہمیں میسّر آتے ہیں۔ چنانچہ ارض وسما کی مختلف چیزوں کو معبود کا نام دینا اور ان کی پرستش کرنا ان کے اس جذبۂ باطن کی تعبیر ہے کہ وہ الوہیّت پسند تھے۔ مگر ماحول کی بداخلاقیوں اور ہدایت کا بکمالہٗ ملنا، حالات کا سازگار نہ ہونا اور جتمی اعمال کے ساتھ رہنمائی کا فقدان صراطِ مستقیم پر آنے میں ہمیشہ ایسے لوگوں کے سامنے سدِّ باب بنتا رہا۔

خالقِ کائنات اپنی مخلوقات کو جانتا ہے اور وہی علیمٌ بذات الصّدور ہے۔ اس لیے ہدایتِ انسانیہ کے لیے مختلف ادوار میں مختلف انبیاءؑ کے ذریعے دعوتِ حق دینا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ خدا نے انسانیت پر اپنی رحمت کو کبھی بند نہیں کیا اور اللہ کی اس عادت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان خود بخود ہدایت سے مفر اختیار کرتا رہا۔

اصُولاً رہنمائی کے بعد ضدّ انسانیہ کا سامنے آنا اور معاشرے کا ضدِّ نفسانی کے ساتھ حق سے نبرد آزما ہونا ایک ایسی حیثیتِ جاہلانہ پیدا کر دیتا ہے جس سے شرافتِ انسانیہ اور تکرمِ انسانیہ بیمار پڑ جاتا ہے جس کو ایک عظیم طبیب کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ یہ طبیب فردِ انسانیہ کا نہیں بلکہ اجتماعِ انسانیہ کا معالج ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک ابنائے وطن، ابنائے ریاست یا ابنائے اجتماعِ انسانیہ ایک بدن کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ اس بدن

کا اپنی حکمت و موعظت کے ساتھ ایسا علاج کرتا ہے جس سے اذہان میں تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے اس کو انقلابِ ذہنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ذہن انسانی موم بتی کی طرح ہے کہ دباؤ پڑنے سے جُھک جاتا ہے۔ اگر اس پر باطل کا دباؤ پڑے تو بُطلان کی طرف جُھک جاتا ہے۔ اگر اس پر حق کا دباؤ پڑے تو وہ حقانیّت کی طرف جُھک جاتا ہے۔ یہی جھکاؤ فرد سے اجتماع میں مبذول ہو کر قوم کی عادتِ ثانیہ بن جاتا ہے جس کو کسی انقلاب آفریں دلیل سے اور انقلاب آفریں عمل ہی سے حق کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔

پروردگارِ عالم اپنی اس عادتِ کریمانہ کے ساتھ نوعِ انسانیّت کے اذہان پر دلائل و براہین حقہ کے ساتھ موعظت فرماتا رہا اور اذہان کو بار بار اپنی طرف متوجّہ کرتا رہا۔ اسی تکرارِ فطری نے انسان کو ہمیشہ حق کے لیے آمادہ رکھا۔ اگر یہ تکرار موعظت متواتر جاری نہ رہتا تو انسانیت کبھی تکرِم انسانیت کا سُراغ نہ پا سکتی اور بَل ھُم اَضَلّ کا مکمل شکار ہو جاتی۔

اس یاد دہانہ شعارِ حق نے انوارِ قلوُب کو ہمیشہ چمکایا اور شعارِ باطن کو روشن کیا۔ یہ روشنی صحتمند عقول و قلوب میں اسی طرح محفوظ رہی جس طرح آفتابِ عالمتاب کی روشنی اس کے غروُب ہونے کے بعد ذرّات کے سینوں میں پنہاں ہو جاتی ہے۔ یہی پنہانی حرارتِ زمین کی روئیدگی میں کارفرما ہو کر حیاتِ جسمانیہ کو برقرار رکھتی ہے جس کا مطلب فطرت کی نظر میں یہ ہوتا ہے کہ زمین کے ذرّات کی حرارت پر جب بھی موسمِ بہار آئے ان میں اس سے استفادہ کرنے کی صلاحیّت موجود رہے۔ من وعن اولادِ آدم۔ انبیاءؑ کی ہدایات سے جو طلوع ہو ہو کر غروُب ہوتی رہیں۔ انسانی سینوں میں اپنی حقانیّت کی حرارت چھوڑتی رہیں

جس کے نتیجے میں انسانیت گمراہی کی موجودگی میں مائل بہ حق رہی تاکہ دوسرا آفتاب ہدایت کے طلوع ہونے پر اس میں حرارتِ حق کی آگ سلگتی رہے۔ اور حیات بخش جذبات کی متاع اس کے پاس موجود رہے اور اس کے سازِ زندگی میں وہ آوازیں باقی رہیں کہ آنے والا اپنی انقلاب انگیز دعوت سے اس آگ کو سلگا سکے۔ اور اس سازِ زندگی کو بجا سکے اور نغماتِ انسانی کو فضائے رُوحانیت میں ارتعاش دے کر انسان کو اپنی حقیقی تہذیب و تمدّن کی طرف بلائے اور اسے اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی تلقین کرے۔ جزوی طور پر ہر نبیؑ کی بعثت کسی قریہ یا شہر کے لیے یا ملک کے لیے انقلاب انگیز تھی۔ یہ انقلاب مادی نہیں بلکہ روحانی انقلاب تھا۔

رُوحانی انقلاب سے زمرۃ الانسان میں انبیاءؑ کے ذریعے انقلاب لانے کی حکمتِ خداوندی یہ تھی کہ رُوح لازم اور مادہ ملزوم ہے۔ جب لازم میں انقلاب آجائے، تو ملزوم انقلاب سے بچ نہیں سکتا۔ اس واسطے کہ ہر ملزوم اپنے لازم کے ساتھ ہوتا ہے بغیر لازم کے ملزوم کا وجود محال ہے۔ عقائد کا انقلاب موہوم خیالات پر ہوا۔ انسانیت کی توہم پرستی، کہیں پتھّر کی مورتیوں اور کہیں سونے چاندی، لوہے اور پیتل کی مورتیوں کو اور کہیں اپنے جیسے انسانوں کو، کہیں شجر و حجر کو، کہیں دریاؤں اور ستاروں کو پوجتی تھی، کہیں حیوانیت کی پرستش ہوتی تھی اور ذلیل سے ذلیل ترین اطوار پرستش کے لیے مہیا کیے جاتے تھے۔

انسانیّت کی اس مذموم توہم پرستی نے کہیں نعل پرستی کی اور کہیں اشترات پرستی کی۔ عورتوں نے مردوں اور مردوں نے عورتوں کی پرستش کی۔ گویا انسانی آبادی اپنے اذہان کی امانتوں کو نفس کے ہاتھوں بار بار فروخت کرتی رہی۔

ان حالات میں عادتِ انسانیہ کا گوشۂ عقل ایسے اعجاز انگیز آئین کے انتظار میں تھا جو اس کو اپنی سچائیوں کے ساتھ مطمئن کرتے ہوئے راہ راست پر چلانے میں تحریص و ترغیب دے سکے۔ تورات، انجیل، زبور اور جملہ صحفِ سماویہ ایک مکمل ضابطۂ حیات کے مختلف اجزا تھے۔ جو اپنے زمانوں میں تبلیغ کے فرائض انجام دیتے رہے اور ان کے مبلغ عظیم المرتبت انبیاءؑ تھے۔ تاریخ عیسوی زمانے کے سامنے اپنے آئین اپنے جزوی اور کلی آئین اور جزوی اعمال کی ترجمان تھی اس سے انسانیت کو کامل طمانیت میسر نہ آسکی۔

آئین کے لیے انسانیت تشنہ لب رہی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ تورات اور اہلِ انجیل سے وعدہ فرمایا تھا کہ تمہیں ایک آخری نبیؐ کے ذریعے آخری کتاب دی جائے گی۔ اس لحاظ سے وہ مکمل آئین فطرت کتاب کی صورت میں موعود ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو اس طرح پورا فرمایا:۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ وعدہ ربانی کا آخری نبیؐ اور آخری کتاب کی صورت میں پورا ہونا، اعجازِ قدرت، اعجازِ نبوت اور اعجازِ کتاب تھا۔ اس حالت میں ظاہر ہے کہ قرآن مجید کا حرفِ اول انقلاب انگیز تھا۔ جس نے پوری دنیا کے اذہان کو ایک کتاب، ایک نبیؐ اور ایک خدا کی طرف مبذول کر دیا۔

قرآنی تعلیمات میں عقائد اسلامیہ ایک ختمی نظریہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج تک دنیا کا کوئی آئین یا منشور بغیر نظریہ کے مرتب نہیں ہو سکا۔ ہر آئین، ہر منشور یا اس کی غرض و غایت کا پس منظر ایک نظریہ ہوتا ہے اور اسی نظریہ پر منشور مرتب ہوتا ہے۔ منشور اس تفصیلی عمل کا نام ہے جس پر دعوتِ عمل دی جاتی ہے اور یہی دعوتِ عمل تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالتی ہے اور پھر تہذیب و تمدن ہی نظریات کے مکمل اور نامکمل ہونے کا مظہر

ہوتے ہیں جس قوم کے تہذیب و تمدّن میں اخلاق کا فقدان ہو، وہی فقدانِ اخلاق نظریہ قوم کے ضعیف ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔ نظریّہ منزل چاہتا ہے۔ منزل جتنی چھوٹی ہوگی نظریّہ بھی اتنا ہی چھوٹا ہوگا اور منزل جتنی طویل ہوگی۔ نظریہ بھی اتنا ہی طویل ہوگا۔

نزولِ قرآن مجید سے قبل اور بعثت نبی آخرالزّماںؐ سے قبل تمام منازلِ اقوام، نظریۂ فطرتِ انسانیہ کے سامنے چھوٹی منازل تھیں جن پر انسان وسعتِ نظر کے ساتھ اپنے افکار کے گھوڑے نہیں دوڑا سکتا تھا۔ اس کے افکار کے گھوڑے مختصر منزل پر رُک جاتے تھے اور یہ محدود جادہّ انسانیت کو مطمئن نہ کر سکا۔

اسی نظریۂ فطرت کے پیشِ نظر، مزاجِ انسانی کے مطابق پروردگارِ عالم نے قرآن مجید جیسے ختمی ضابطۂ حیات کے ساتھ عقائد کا وہ لامتناہی نظریہ پیش کر دیا جس کی حدّیں یوم النّشور تک طویل کر دیں اور طمانیّت کی انتہا اور لافانی منزل خوشنودئ ربّ کے ساتھ آخرت کو قرار دیا تاکہ فکرِ انسانی کو افکار کی رفتار تیز رکھنے میں کبھی رکاوٹ محسُوس نہ ہو۔ اور وہ زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی اپنے ربّ کی جستجو میں سرگرمِ عمل رہے۔

چنانچہ قرآن مجید نے عقائد پر سیر حاصل بحث فرمائی اور قرآن مجید کا سب سے پہلا مخاطب انسان ہی قرار پایا جس کے عقل و دِل و نگاہ کو لَا مَعْبُودَ اِلَّا اللّٰہُ اور لَا مقصُودَ اِلَّا اللّٰہ کے رمُوز سے باندھ کر جادۂ زیست پر اپنے مجوزہ عبادات، معاملات معاشرت اور اخلاق کی سبیلوں پر چلا دیا۔

چونکہ انسان اپنے ماضی کی عادت میں اپنے نامکمّل نظریات کے ساتھ نامکمل عبادات، نامکمل معاملات اور نامکمل معاشرت سے مانوس تھا۔ اس نامکمّل انس کی بیخ کنی کے لیے ایک کامل نظریّہ کے ساتھ اسے کامل اعمال سے نوازا۔ اس نورانی عقیدہ نے ذہنِ انسانی

کو سچی عبادتوں کے ساتھ خدا سے مانوس کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں آغاز اسلام صدرِ اوّل کے دور میں اپنے معاملات فطریہ اسلامیہ پر حاوی ہو گیا اور اسلام کا تہذیب و تمدّن اپنے فطری خطوط پر مرتّب ہونا شروع ہو گیا۔ آغازِ عمل میں اسلام نے سب سے پہلے ان تمام غیر فطری توہمات کی بیخ کنی کی جو ارتقائے انسانیت کے لیے سدّ راہ تھیں۔

اسلام کی حقانیت کی پہلی ضربِ کاری رہبانیت اور کاہنیت پر پڑی۔ کیونکہ یہ لوگ اس دلپذیر انداز سے ترکِ دنیا کرتے تھے کہ انسانی طبائع بے ساختہ ان کی طرف مائل ہو کر ترکِ دنیا کے لیے مجبور ہو جاتی تھیں۔ یہی مجبوری حصولِ مقصودِ مطلق کی راہ میں آڑے آتی رہی اور انسان اپنے فطری علوم سے بے بہرہ ہو کر معلومات سے دُور ہوتا رہا۔

اس قسم کی عبادات و معاملات نے انسانیت کو پھلنے پھولنے اور معراج کمال حاصل کرنے میں ہر گام پر روکا۔ ان راہبوں اور کاہنوں کے مجاہدات ترکِ دنیا پر محمول تھے۔ حالانکہ دنیا ہی دسترخوانِ علم و عمل اور دسترخوانِ معلومات ہے اور دنیا ہی وہ عالمِ اسباب ہے جس کو عبادت کا ذریعہ بنایا جاتا ہے اور دنیا ہی زندگانیٔ دنیا کا سامان ہے۔ بعثت نبوّت کے لیے بھی اسی دنیا کو تجویز کیا گیا اور نزولِ قرآن کے لیے بھی اسی دنیا کو تجویز کیا گیا اور مکہ معظمہ کو بھی اسی دنیا میں تجویز کیا گیا۔ اسی دنیا کے لیے اس کو مرکزِ عبادت بنایا اور فرمایا گیا:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ؕ

یعنی سب سے پہلا گھر دنیائے انسانیت کی ہدایت کے لیے وہ ہے جو مکہ مکرمہ میں مبارک بنایا گیا اور سارے جہانوں کی ہدایت کے لیے بنایا گیا۔

یہی دنیا انبیاء کا معمل خانہ رہا۔ اسی پر سعادت دارین کے تجربے کیے گئے۔ یہی دنیا مصلّے گاہِ عبّاد و زہّاد رہی۔ ایک لاکھ کئی ہزار انبیاء اسی زمین پر مبعوث ہوئے۔

آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال کر اسی دنیا میں بسایا گیا اور دونوں میاں بیوی نے اسی دُنیا میں بنائے انسانیت ڈالی اور اس کے لیے کھیتی باڑی کی ابتدائی اور نشیمن کا آغاز کیا۔ اسی دنیا پر سلاطین نے حکمرانی کی اور انسانوں کو حکمرانی کے ضابطوں میں پابند رکھا۔ اسی دُنیا کے سونا و چاندی کو زیورِ جان بنائے رہے۔ اسی دنیا کی پورب و پچھم کی ہواؤں نے دانۂ گندم کو پالا۔ اسی دنیا کی مٹی سے دانۂ گندم نے نمود پائی اور اسی دُنیا کے انسانوں کے لیے وہ رزق کا باعث بنا۔ اسی دنیا کا پانی پی کر انسانوں نے اپنی پیاس بجھائی۔ اسی دنیا کے شمس و قمر سے انسانی زندگیوں نے حرارت پائی۔ اسی دنیا کے کواکب سے انسانوں نے اپنی راہیں ڈھونڈیں اور منزل کا سُراغ لگایا۔ اسی دُنیا کے لیل و نہار سے انسان وابستہ رہے۔ اس دُنیا کی وہ کون سی ایسی چیز ہے جس کو راہبوں کا ہنتوں اور سادھوؤں نے استعمال نہیں کیا۔ اگر ان کی ترک دنیا بھی متاعِ دنیا سے بچ نہ سکی تو ظاہر ہے کہ ایسی رہبانیت ایسی کاہنیت اور ایسی سادھویت کی بنیاد نفاق پر مبنی ہوگی۔

جس عبادت کی بنیاد نفاق پر مبنی ہو، وہ اللہ کو کیونکر پا سکتی ہے۔ یہ بڑا اعجوبۂ انسانیت تھا جس نے ایک طرف دانہ گندم کھایا اور دوسری طرف اس سے ہجرت اختیار کی اور تیسری طرف مہاجر بننے کے بعد بھی اس سے نہ بچ سکا۔ غاروں میں، دشت و جبل میں، صحراؤں میں جہاں بھی دنیا سے بھاگتا ہوا گیا۔ دنیا اس کے زیر پا رہی۔ وہ دنیا کی ہواؤں میں سانس لیتا رہا اور دنیا کا پانی پیتا رہا اور دانہ گندم کھاتا رہا اور دُنیا کی نباتات کے کپڑے پہنتا رہا۔

نہ جانے ان سب چیزوں کی موجودگی میں وہ کیسے تارک الدنیا کہلاتا رہا۔ اس توہم پرستی نے انسانیت کو جادۂ حق پر چلنے کی شجاعت سے محروم کر دیا تھا۔ انسان بزدل، زندہ کام چور ہو گیا تھا

اور فطرت کی پیہم خلاف ورزی پر آمادہ کار ہو چکا تھا۔ حالانکہ سیّدنا عیسٰی علیہ السّلام کی تعلیم ایک ظلم و عدوان کے زمانے میں رحم و کرم کا مجسمہ بن کر آئی تھی اور اسی رحم و کرم کی تبلیغ کے ساتھ وہ ظلم و عدوان کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ آپؑ نے رہبانیت کی تبلیغ ہرگز نہیں کی۔ سیدنا عیسٰی علیہ السّلام کے زمانے میں وہ خداشناس راہب جنہوں نے نفاقِ نفسانی کو ختم کرنے کے لیے تزکیۂ نفس کیا تھا، سرِبازار خدماتِ انسانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بعد کے مساہلہ پسند مذہبیوں نے ترکِ دنیا کی بنا ڈال کر مذہب کے عملی خطوط سے اپنی قوم کو ہٹا دیا جس کے نتیجے میں وہ لوگ کسی داعیٔ برحق کی حق پسندانہ تلقین برداشت کرنے کے اہل نہ رہے۔ چنانچہ پروردگارِ عالم نے وقت کی سب سے بڑی ذہنی عصبیت کا حل اسلامی عقائد اور عبادات و معاملات کے ساتھ اس طرح کیا کہ اعلائے کلمۃ الحق بہ لسانِ قرآن مجید بہ لسانِ نبی اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام بلند ہوا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ط

"یعنی اے بنی نوعِ انسان! تم سب اس پروردگارِ عالم کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا فرمایا، تاکہ تم صحیح متقی بن سکو۔ وہ اللہ جس نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنایا اور آسمان کو تمہارے لیے سائبان بنایا اور بلندیوں سے تمہارے لیے پانی برسایا اور اس سے پھل پھول پیدا فرما کر تمہاری روزی کا انتظام فرمایا۔ لہٰذا تم ایسے خدا کی موجودگی میں اس کے لیے کسی کو شریک مت گردانو۔ اس حالت میں کہ تم جانتے ہو۔"

ان آیات میں قرآن مجید کی مخاطب نوعِ انسانیت ہے۔ قرآن مجید کی ہمہ گیر تبلیغ جنبہ داری سے بلند و بالا ہو کر اللہ کی مکرم مخلوق کو راہِ حق پر چلنے کی دعوت دیتی ہے

اس آواز نے بھولی ہوئی دنیا کو حقیقت کی جانب راغب کر دیا۔ یہ آواز باطل کو لرزہ براندام کر دینے والی عقول و قلوب کو تسخیر کرتی ہوئی ہر نگاہ کو نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی طرف متوجہ کر دینے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔

اسی توجہ انسانیت پر قرآن مجید، نبی آخر الزماں کی پیہم معجز نمائی، سخت اذہان کو اس طرح نرم و گداز کر رہی تھی جس طرح بھٹی میں لوہا گرم ہونے کے بعد پیہم ضربوں سے ہتھیار بن جاتا ہے۔ بعینہٖ سخت اذہان ہدایت کی متواتر ضربوں سے ڈھل ڈھل کر "سیف اللہ" بن رہے تھے۔

اس کے بعد منتشر، متزلزل اور متذبذب عبادات کو کامل اور مستقل عبادتوں میں اس معجز نمائی کے ساتھ تبدیل کیا گیا کہ رہبانیت اور کاہنیت کی بجائے صحیح تزکیۂ نفس، صحیح ضبطِ نفس اور استقامت کے ساتھ معینہ اوقات میں عبادات کو تنفیذ فرمایا گیا کہ معاملاتِ انسانیہ کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع مل سکے۔ اس فطری تقسیمِ اوقات نے عبادات و معاملات کو اس عدل و انصاف کے ساتھ معاشرے میں تقسیم کر دیا جس سے ضیاعِ وقت سے قوم کو مکمل امان ملی۔ قرآن مجید کی تقسیمِ اوقات سراسر فطرت کی ترجمان ہے جس پر کوئی فکرِ سلیم اعتراض نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا ؕ

نماز مومنوں کے لیے وقتِ معین میں مقرر فرمائی گئی۔ اس کے علاوہ معاملاتِ انسانیہ کی اتنی زیادہ تاکید فرمائی گئی کہ اس سے مفر ناقابلِ معافی جرم قرار دیا گیا۔ اس انوکھی تبلیغ نے معاشرے کو روحانی، بدنی، علمی اور عملی میدان میں متحرک کر دیا۔ یہ تحرک ایک منظم مشین کی طرح بروئے کار آیا۔ کہ امرِ الٰہی اور امرِ رسول ؐ نے یکبارگی تمام پیروکارانِ اسلام کو حرکت

دے دی۔ یہ اتحادی حرکت آئینِ فطرت کے مکمل ہونے کی دلیل تھی۔

ریگزارِ عرب کے اس آئینی تہذیب و تمدّن نے انسانی دنیا میں تہلکہ بپا کر دیا۔ نزولِ قرآن اور اس پر عمل پیہم کی آواز نے بڑے بڑے فراعنہ اور نماردۂ زمانہ کو اس فطرت کی آواز کی طرف متوجّہ کر دیا۔ قرآن مجید کی پہلی آواز نے کائنات کے سینوں کو اللہ کی طرف ڈھال دیا تھا۔ اسلام نے رہبانیّت اور کاہنیّت کی اصطلاح کا ردّ عمل اپنی فطری عملی اصطلاح فقر کے ساتھ اس طرح کیا۔ اَلْفِقْرُ فَخْرِیْ

حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے اس فخری فقر کا ترجمہ خدائے لم یزل کے سامنے انتہائی عبودیت کے اظہار کا تھا اور مسلمانوں کے لیے بھی اس اصطلاحی فقر کی تجویز فرمائی کہ وہ بارگاہِ ربِّ جلیل کے سامنے ہمہ وقت عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنی عبودیّت کا اظہار اس طرح کریں کہ اللہ تعالیٰ کے درِ اقدس کے فقیر ہو کر کائنات پر امیری حاصل کریں اور شاہی میں خدا کے فقیر والا مزاج پیدا کر کے اپنی عاجزی کا ثبوت پیش کریں اور نہایت غربت میں شاہی استغناء کا منظر پیش کرتے ہوئے غیر اللہ سے بے نیازی کے ساتھ اپنی عبودیت کا اظہار کریں۔

اسلام نے لا رھبانیۃ فی الاسلام فرما کر لفظِ رہبانیّت اور عادتِ رہبانیّت کا ہمیشہ کے لیے دائرہ اسلام میں خاتمہ کر دیا۔ قرآن مجید نے معاملات کی تشریح انفاقِ مال کے ساتھ اقتصادی نظام کو درست کرتے ہوئے مساوات پر زور دیا۔ اور اکابرینِ قوم عوام کی قولاً و فعلاً او عملاً خدمت کرنیکی شدید تاکید فرمائی کہ وہ اپنی اپنی صلاحیتوں کو عوام کے لیے بروئے کار لائیں اور عوام وخواص کو اخلاقِ باطن کے ساتھ اعمالِ ظاہریہ کی تعلیم دے کر اسلام کی صداقتوں پر روشنی ڈالنے کا فرض انجام دیں اور راستے سے ایک اذیّت ناک

کانٹے کے اٹھانے سے لے کر ایوانِ شاہی تک کے انتظام پر مفصل بحث کی اور برّی،
بحری راستوں کو امن عالم کے لیے استوار کرنے کی دعوت دی اور یہاں تک اخلاقی عمل
اسلام کو ظاہر کیا گیا کہ غیر مسلم پڑوسی کے ساتھ بھی روادارانہ سلوک کیا جائے اور عالم انسانیت
سے ایسے باہمی معاملات کے ساتھ ربط قائم کیا جائے کہ وہ اخلاقِ اسلامی سے متاثر ہو
کر دعوتِ حق کو قبول کرلے۔ اس اخلاقی تعلیم کے لیے پوری ملّتِ اسلامیہ اور اس کے علماء
کو مامور کیا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
(یعنی تم ہی بہتر اُمّت ہو۔ اس واسطے کہ تم لوگوں کو اچھائی کی طرف بلاتے اور
برائی سے منع کرتے ہو۔)

پھر علمائے امّت کے لیے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
(یعنی تم میں ایک ایسے مخصوص گروہ کا ہونا ضروری ہے جو اچھائی کی طرف
دعوت دے اور برائی سے منع کرے۔)

اس آیت میں علمائے کرام کی تبلیغی ضرورت پر امّت کی توجہ کو مرکوز کیا گیا ہے۔ ان
آیات میں خواص و عوام اسلام دونوں کو قولاً و عملاً عبادات و معاملات اسلامی معاشرت
اور اخلاقِ اسلامی کے ساتھ دعوتِ حق کے اہتمام کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور "اُخْرِجَتْ
لِلنَّاسِ" کے الفاظ سے یہ ثابت ہوا کہ زمین کے فاصلے بغیر سامانِ سفر کے پورے
نہیں ہو سکتے۔ اور یہ کہ ہر وہ سامان جو انسانیت تک تبلیغ حق پہنچانے میں ممد ہو سکتا ہے۔
اس کو حاصل کرنا امّت کے لیے ضروری ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ امّت کو ہر زمانہ سے گزر کر

انسانیت تک تبلیغ کو پہنچانا ہے اور ہر زمانہ کے مطابق جدید تقاضوں کے پیش نظر اس کو سامانِ رسل و رسائل، سامانِ ابلاغ مہیا کرنا ضروری ہے ورنہ برّی اور بحری راستوں سے گزر کر بلند و بالا چٹانوں کو عبور کر کے اور غیر معلوم راہوں سے بلا سامانِ سفر گزر کر تبلیغ کرنا مشکل ترین ہو جاتا ہے۔

اس سے وقت کی ان تمام مشینوں کا حاصل کرنا ثابت ہو گیا ہے جن کی دورِ جدید میں انسانیت کو ضرورت ہے۔

قرآن مجید معاشرت کی تشریح ریاست کی فلاح و بہبود کے ساتھ کرتا ہے اور معاشرے کی فرداً اور اجتماعاً آسودگی چاہتا ہے۔ انتظامِ ملکی ایسے مقدس ہاتھوں میں سونپنا چاہتا ہے جو ریاست کے باشندوں کے لیے شفیق ہوں۔ سیاسی حسنِ انتظام کو اس انداز سے ریاست پر مسلّط کرنا چاہتا ہے جس سے عوام کی کارکردگی کی صلاحیتیں نمودار ہو کر انتظامِ ملکی میں معاون ہو سکیں۔ قرآن مجید معاشرت میں ایک فریادی کی فریاد عدالتِ عظمےٰ میں اس طرح پیش کرتا ہے :-

پیش قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است

معاشرتِ اسلام کے حسنِ اخلاق کا نمایاں چہرہ ہے جس کا شاداں و فرحاں ہونا قلب و جگر کی مسرّت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور معاشرت اس صحت مند حقیقت کا نام ہے جس کا صحت مند ہونا سیاست ملکی کے صحت مند ہونے کی بیّن دلیل ہے۔ ریاست کی کلی معاملات پر سیاست کا تصرّف اتنا حسین ہو کہ معاشرہ احکاماتِ ملکی و ملّی کی تعمیل بخوشی انجام دینا شروع کر دے۔

جو معاشرہ احکامات کی تعمیل میں تساہل برتتا ہے۔ اس معاشرے کا تساہل سیاسی انتظام کے نامکمل ہونے کی علامت ہوتا ہے۔ قرآنی تعلیمات حسنِ انتظامِ ملکی وملّی کے ساتھ مجموعی طور پر معاشرے کو عملِ پیہم کی دعوت دیتے ہیں۔ اجزائے معاشرت کے مجموعے کا نام حسنِ معاشرت ہے۔

قرآن مجید کی نظر میں سیاست حسنِ انتظام کا نام ہے نہ کہ حسنِ کذب کا نام ہے۔ اسلامی سیاست علمبردارِ حق وصداقت ہوتی ہے۔ اس کا انتظام ریاست کی داخلی اور خارجی حیثیات پر جامعیت اور مانعیت کی حیثیت پر ہوتا ہے۔ وہ ریاست کے داخل وخارج میں ایک ایسی مضبوط دیوار کی حیثیت رکھتی ہے جو صلاحیات وحیثیاتِ ملکی کی جامع اور مہلکاتِ داخلیہ اور خارجیہ کے لیے مانع کی مانند ہوتی ہے۔

سیاسی دیوار کا مستحکم ہونا ریاست کے لیے دیوارِ حوض کی مانند ہے۔ اگر دیوارِ حوض کمزور ہو تو کسی بھی وقت اس کے ٹوٹ جانے کے امکانات ہوتے ہیں۔ دیوار جب بھی ٹوٹ جائے گی۔ حوض کی جامعیت ختم ہو جائے گی اور دیوارِ حوض جتنی مضبوط ہوگی۔ حوض کی جامعیت کی بقاء کا پیش خیمہ ہوگی۔ اور مہلکاتِ خارجیہ کے لیے ایک قوی حصار کی صورت میں مانع ہوگی۔

دُنیائے انسانیت میں جہاں کہیں بھی سیاسی انتظامات غیر مستحکم ہوئے۔ اس ریاست کو بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلام استحکام ملکی کے ساتھ تبلیغ چاہتا ہے۔ اسلام کی یہ معاشرت کائنات پر تفوق و برتری رکھتی ہے۔

قرآن مجید اخلاقِ اسلامی کی تشریح تقویٰ کے ساتھ کرتا ہے۔ اس تقویٰ کے ساتھ

جس کا تعلق "ایمانِ بالغیب" کے ساتھ ہو اور اقامتِ صلوٰۃ، انفاقِ مال، ایمانِ بالکتب اور یقینِ آخرت پر ان طرز و اطوار کے ساتھ تعلیمِ اخلاق دیتا ہے جو حُسنِ نیّت سے اٹھ کر حُسنِ عمل کی صورت اختیار کرے۔

اسلام نے اخلاق میں قول کا بڑا دخل ثابت کیا ہے۔ اس واسطے کہ حُسنِ کلام دِل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ اخلاق کا بنیادی پہلو ہے اور دوسروں کے دِلوں پر اثر انداز ہونا اس کی تاثیر ہے۔ اخلاق کی جسمِ انسانی میں قدرتی طور پر دو صورتیں بنتی ہیں، اخلاقِ نفسانی اور اخلاقِ رُوحانی۔

قرآن مجید کی جملہ تعلیمات صاحبِ ایمان کو ایمان سے ابتدا کرنے کی اس واسطے تاکید کرتی ہیں کہ جسمِ ثقیل کے ذرّے ذرّے میں صرف رُوحانیت ہی کارفرما ہے۔ ورنہ وہ بیکار مردہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی جملہ حرکات و سکنات رُوح پر مرتّب ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس کی تعلیمات حقائق کے پیشِ نظر دل کی نیّات کو پاکیزگی کی تعلیم دے کر رُوح میں تلاطم پیدا کر کے ارادوں کو نمو کرتے ہوئے اعمال کی صورت اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ اخلاقِ اسلامی کا منشاء اپنی ذاتی خواہشاتِ نفسانی کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دوسروں کی ضروریات کی تکمیل ہے۔ اخلاقِ اسلامی جو چیز اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی چیز اسی طرح دوسروں کے لیے بھی پسند کرتا ہے۔ اخلاقِ اسلامی جذبات کُشی، مردم آزاری سے بچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اخلاقِ اسلامی متاعِ زِلیست تک کو حق و صداقت پر قربان کرنے کے لیے سعادت محسوس کرتا ہے۔ اخلاقِ اسلامی، اسلام کی ہدایات پر اس واسطے عمل پیرا ہونے کی مکمل دعوت دیتا ہے کہ اسلام جزءً اور کلًّا مجموعۂ اخلاق ہے۔ اس کی کوئی شق اخلاق کے سوا نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

"یعنی اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے طریقے سے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کہ وہ تمہارا علی الاعلان دشمن ہے۔"

ادخلو فی السلم کی صحیح تشریح باضابطہ اعمال اسلام کی پیروی ہے جو اخلاقیات پر مبنی ہے اور اسلامی اعمال سب کے سب نیکیاں ہیں اور ہر نیکی اخلاق کی جزو ہوتی ہے اور نیکی ہی منفعت کے میدان میں انسانیت کے لیے سُود مند ثابت ہوتی ہے۔ اخلاق اس فراوانی سعادت کا نام ہے جو بہمہ وجوہ خیر الناس اور ینفع النّاس پر محمُول ہو اور ہر وہ عمل شیطان کی تخلیق ہے جو انسانیت کے لیے اذیّت کا مُوجب ہے اور ہر قسم کی اذیّت نوعِ انسانی کے لیے جذبات کشی اور مردم آزاری کا باعث بنتی ہے۔

اس واسطے مسلمانوں کو اسلامی اخلاق حمیدہ سے ہٹ کر شیطان کی بُرائیوں کی پیروی کرنے سے منع کر دیا گیا ہے اور اس کی راہوں پر چلنے سے ممانعت کر دی گئی ہے تاکہ وہ کسی طرح بھی اذیّت ناک بُرائیوں سے ہمکنار نہ ہو سکے اور اپنے دامنِ اخلاق کو امانت و دیانت کے ساتھ بچاتا ہوا عافیت کا مظاہرہ کر سکے۔ اسلام کی جملہ عبادات و معاملات عافیت کے نشانات ہیں۔

اخلاق کا تعلق تعلیماتِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ تاریخ اعمال اسلامیہ سے زیادہ ہے۔ اور اخلاق کا تعلق انبیاءؑ، صدیقینؓ، شہدأ، اور صالحین کے اقوال و افعال کے ساتھ وابستہ ہو کر تربیّت پاتا ہے۔ اخلاق کے لیے صالحین کی تقلید کرنا از بس ضروری ہے۔ جس کو تاریخ تصوّف میں طریقت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسی واسطے علمائے اسلام نے تصوّف کو اخلاق کا نمونہ قرار دیا ہے اور تصوّف اسلام ہی معیار اخلاق ہونے کی اہلیت رکھتا

ہے۔ تمام صحابۂ کبارؓ شریعت اور طریقت کے فرمانبردار تھے اور یہاں طریقت سے مُراد رسمی طریقت نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی تعلیمات کی تعمیل میں جو اعمال مرتب ہو کر سامنے آئیں ان کے احوال کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کا نام طریقتِ اسلامیہ ہے۔

حضور سرورِ کائنات، فخرِ موجودات علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے تعمیلِ احکامِ الٰہی کے ساتھ جو اقوال، افعال اور احوال حاصل کیے۔ وہ آپؐ کی فرماں برداریٔ حق کے نتیجہ میں مرتب ہو کر سامنے آئے۔ آپ ازلی طور پر نبیؐ تھے۔ مگر میدانِ تعمیل میں بعثتِ نبوّت سے دمِ واپسیں تک حتمی طور پر جن احوال، اقوال اور افعال کی آپؐ نے تکمیل فرمائی۔ وہ سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہو گئے۔ ان کی تقلید طریقۂ نبوّت کی تکمیل تھی۔ یہ طریقت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر مرتب ہوتی۔ اور تابعینؒ نے صحابہ کی طریقت کی تقلید کی یہ شجرہ تقلیدِ طریقت کی تکمیل کا آغاز قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے ہوا۔

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا یعنی

"جو کچھ تمہیں رسُولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دیں۔ اس کو اختیار کرو اور جس چیز سے وہ منع فرمائیں اس سے باز آجاؤ۔"

ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے اپنی امّت کو قولاً، عملاً اور اصولاً نیکیوں کا حکم دیا اور بُرائیوں سے منع کیا۔ یہ ترتیب تعمیل تقلید صراطِ طریقت پر ہی میسّر آسکتی ہے۔ چنانچہ اسلام نے ہر شعبۂ زندگانی میں اسی عملی پروگرام کو طریقت کی تقلید سے ہی سرانجام دیا۔

تجارت، صنعت و حرفت، تبلیغ و حکمت، سیاست، تصرّفِ ملکی، فردی و اجتماعی طور پر جہاں بھی اور جس طرح بھی افرادِ اسلامیہ کو موقع ملا۔ اسلام کے اخلاق کے نمونہ کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو جزوی اور کلی طور پر سرانجام دے کر اخلاقِ اسلامی پیش کیا۔

الدّین کلہ ادب ۔ دین سارے کا سارا مجموعۂ ادب ہے ۔ حاکم کا محکوم سے انصاف اور رواداری ۔ امیر کا غریب سے حسنِ سلوک ۔ عالم کا جاہل سے تلطّف، قوی کا ضعیف سے حُسنِ مروّت ۔ صحت مند کا مریض سے حسن مدارت، مقیم کا مسافر سے حُسنِ التفات، مظلوم کو ظالم کے پنجۂ استبداد سے بچانا، معاشرے سے بدعنوانیوں کو دُور کرنا ۔ ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو اعتدال پر لانا ۔

عدل و انصاف کو بروئے کار لانا، ازدواجی زندگی کو فطرت کی نہج پر چلانا، اولاد کی اعلیٰ تربیّت، خاندان کی پرورش، پڑوسی کے حقوق کی نگہداشت، یتیم کے مال کی حفاظت بیوگان کی خدمت، دردمندوں، آفت رسیدہ لوگوں کی خبرگیری، سفید پوشوں کی دادرسی بڑوں کا ادب، چھوٹوں سے شفقت، مہمان کی تواضع، نوعِ انسانیت سے پیار، امنِ عالم کی تبلیغ، بھُولے بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانا ۔

مصیبت میں دستگیری کرنا، ایفائے عہد، رُوٹھے ہوتے لوگوں کو منانا، اور بچھڑے ہوؤں کو ملانا، علم و عمل کی دعوت دینا، درس و تدریس کے مشاغل کو جاری رکھنا، راستوں کو ٹھیک کرنا، ماں، باپ، استاد اور معلّمینِ قوم، محققینِ قوم اور مدبّرینِ قوم کی توقیر کرنا کاروباری زندگی میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا، ذخیرہ اندوزی سے بچنا ۔ بیع و شراء میں انصاف کو ملحوظ رکھنا، ہر قسم کے حرام سے بچنا اور لوگوں کو بچانا ۔ جلب منفعت کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بچنا اور لوگوں کو بچانا ۔ کسی کا دِل نہ دُکھانا ۔ خدا کی معیّنہ حدود کے اندر رہنا اور تجاوز سے بچنا وغیرہ ۔

یہ سب چیزیں دستورِ اخلاقِ اسلامیہ میں داخل ہیں ۔ ان میں سے ہر شئے کی حفاظت اخلاقِ اسلامیہ کی حفاظت ہے ۔

قرآن مجید اور دعوتِ فکر و نظر

قرآن مجید فکرِ انسانیہ کو صحیح راستوں پر چلانے کا مدعی ہے
اور فکرِ انسانیہ اسی وقت صحیح راستوں پر چلتی ہے جب
نفس کے غلیظ ہنگاموں سے اسے فطرت کی کرشمہ سازیوں
کی طرف مائل کر کے بچایا جائے۔

قرآن مجید کلام بلیغ ہے اور ہر کلام تکلم سے متعلق ہو کر مسموع ہوتا ہے۔ طرز تخاطب کی عادت ہے کہ وہ احساس باطنیہ سے اُبھر کر احساس لامسہ حسیہ لسانیہ سے لمس کرتے ہوئے مخارج بن کر بصورتِ صوت تکلم بنتا ہے اور صاحب خطاب قوائے حواسِ باطنیہ و ظاہرہ کے رجوع سے خطاب کرتا ہے۔

خود قوتِ متکلمہ کے ساتھ ارادوں میں شریک ہو کر خود سامع بھی ہوتا ہے اور مخاطبین کا ناظر بھی ہوتا ہے۔ مخاطبین کے لیے متکلم بھی ہوتا ہے اور قوتِ حسیہ، بدنیہ، قوتِ سامعہ قوتِ باصرہ اور قوتِ شامہ سب کے شریک حال ہو کر تقریر کرتا ہے اور یہ ساری تقریر اس کی دنیائے فکر سے اخراج کرتی ہوئی عالم خارج میں جاری ہوتی ہے اور مخاطبین سب کے سب اپنی فکروں پر استوار کلامِ خطیب کو سنتے ہیں۔ یہی سُننا سامعین کو سمجھنے کے لیے دعوتِ فکر دیتا ہے کلام خداوندی۔ خدا کی زبان سے لحن و آواز سے منزّہ ہے۔ اس کو سننے کے لیے جبرئیل امین کو جو ذی شعور اور ذی فکر فرشتہ، نورانی ہیں۔ ذہن نشین کرایا گیا۔ یہی فکر ہے جو احساس باطن سے کلامِ الٰہی وصول کرنے کے لیے متوجہ ہوئی اور صوت میں کلام الٰہی لحن اور آواز میں مبدّل ہو کر سب سے پہلے غارِ حرا میں اپنے محبوب پاک محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے سامنے بلند ہوئی۔ یہ وہ فکرِ معظم تھی جس نے نہایت بے تابی اور محبت کے ساتھ اپنے احساسات ظاہریہ و باطنیہ کے ساتھ اپنے سمعِ مقدس کو اس کلام کی جانب مرکوز کیا۔

ختمی المرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خدا کے کلام کو بصورت لحن و آواز

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ؕ

کی کلامِ پاک کی صورت میں سُنا اور اس کو پڑھا۔ اِس وقت جو حالت سرورِ کائناتؐ پر طاری ہوئی۔ حضور علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم نے اس کو من وعن اپنی حدیث میں بیان فرمایا۔

آپؐ پر رقتِ عظیمہ طاری ہوئی اور آپؐ کا وجود کپکپانے لگا۔ آپ نے جبرائیلِ امین کو جواباً فرمایا۔ مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔ میں پڑھا ہوا نہیں۔ پھر حضرت جبرائیلِ امین نے آپؐ کو اپنے سینۂ مبارک کے ساتھ لگایا اور دوبارہ فرمایا: "اِقْرَاْ" آپؐ نے دوبارہ جواب جواب دیا، مَا اَنَا بِقَارِیْ۔ سہ بارہ بھی یہی تکرار ہوا۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ کلامِ خدا، خدا کا کلام ہے۔ یہ وُہی پڑھ سکتا ہے۔ میں اس کو پڑھ نہیں سکتا۔ مگر دادِ خداوندی نے آپؐ کو اپنی محبت سے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے پڑھنے کی قدرت بخشی اور آپؐ نے اس کو پڑھا۔ قرآن مجید کا نزول حضور علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم کے قلب سلیم پر ہوا۔ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللہِ

یعنی جبرائیل امینؑ نے اس کلام کو اللہ کے حکم سے آپؐ کے دِل پر اُتارا۔

صاف ظاہر ہے کہ فکر دل کا مظروف ہے اور دِل ظرفِ فکر و بصیرت ہے۔ ہر دعوت کا پہلا عمل فکر و بصیرت ہوتا ہے۔ بعد میں بصیرت اور فکر دونوں بر سبیل ارادہ عقل و دل و نگاہ پر اُتر آتے ہیں اور قوائے ظاہریہ کے ذریعہ عالمِ خارج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی اثر اندازی افعالِ باطن کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ؕ

ہم نے قرآن مجید کو عربی جیسی فصیح و بلیغ زبان میں نازل کیا تاکہ تم اس کو سمجھ سکو۔

سمجھنے کا دار و مدار حواسِ باطن پر ہے۔ سننے اور دیکھنے کا تعلق بصارتِ ظاہریہ

اور سماعتِ ظاہریہ سے ہے۔ گویا دیکھنا اور سننا ظاہری آلات کے ذریعے باطنی تفہیم کے لیے ہوا۔ یہی تفہیم ہدایت کا یقینی باعث ہوتی ہے۔ نوعِ انسانی نے جس چیز کو اپنے مزاج پر مسلّط کیا۔ وہ افہام و تفہیم ہی کی کارستانی تھی۔

ازل کے روز پروردگارِ عالم نے صاحبِ شعور ارواح کو تفہیم کے لیے ہی مخاطب فرمایا تھا اور اسی تخاطب کے الفاظ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ اس اَلَسْتُ میں استفہامیہ خطاب ہے اور استفہام، ہمیشہ فکر و نظر کی موجودگی میں ہی ادراک پاتا ہے۔

قرآن مجید میں جا بجا احکامات اور حکایات اور رموز و اسرار بیان فرماتے ہوئے اپنے مخاطب انسان کو لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ اور لَعَلَّھُمْ یَتَدَبَّرُوْنَ فرما کر تفہیم کرائی۔ یہ احکامات، یہ امثال و حکایاتِ قرآنیہ تفکّر چاہتے ہیں اور تدبّر چاہتے ہیں یعنی ان کے رموز و اسرار اہلِ فکر اور اہلِ تدبّر کے لیے ہیں۔

اور پھر ـــــــ "اولی الباب" فرما کر اہلِ نظر کو دعوت دی۔ پھر اُولی العلم" فرما کر اہلِ علم کو دعوتِ فکر و عمل دی۔ درحقیقت کوئی مدّعا جامۂ تکمیل نہیں پا سکتا۔ جب تک وہ فکر و نظر کے سامنے اجزائے تحلیل بن کر نہ آسکے۔ گوشۂ حکم، گوشۂ اشیا، گوشۂ عمل کی باریکیاں بیان کرنا صرف فکر و نظر ہی کے سپرد کیا گیا ہے۔

اگر فکر و نظر محض خانۂ عالم میں صرفِ تشریح نہ ہوتیں تو گوشۂ عالم کے رازہائے سربستہ کی تشریح انسانیت کے لیے محال ہو جاتی۔ فکر و نظر ہی صورتوں کا ترجمہ، تشریح اور تفصیل و توضیح کی صورت میں کرتی ہیں۔ نظر کا کام صورت کا صحیح جائزہ ہوتا ہے اور سمع کا کام صورتِ صوت کا جائزہ ہوتا ہے۔ اور حِس کا کام لمسِ محسوسہ کا جائزہ ہوتا ہے

اور شامہ کا کام مشموم کا جائزہ ہوتا ہے اور ادراک کا کام فکر و بصیرت کے حوالے ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر آنکھ نے صوتِ لفظ کا صحیح جائزہ لیا، مگر لفظ کے معانی لفظ کی صورت میں مستور و محجوب ہوتے ہیں جن کو ظاہری آنکھ مطلقاً نہیں دیکھ سکتی اور صورتِ لفظ کے معانی کو معلوم کرنے کے لیے علمائے معانی کو ظاہری آنکھ بند کرنی پڑتی ہے۔ آج تک الفاظ کا ترجمہ بصارتِ ظاہریہ سے نہیں ہو سکا، بلکہ جملہ تراجم الفاظ کے اسرار ہونے کی حیثیت میں بصیرتِ فکریہ نے اخذ کیے۔

جملہ علومِ سماویہ، جملہ علومِ ارضیہ کے تراجم بصیرتِ فکریہ نے مہیا کیے۔ ہر صورت مستور سیرتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جب تک ان سیرتوں کا ادراک نہ کیا جائے حقیقتِ صورت کا سراغ نہیں مل سکتا اور صورِ مختلفہ کی سیرتوں کو جنہیں اصطلاحِ علومِ انسانیہ میں معانی کہا جاتا ہے وہ صفحۂ ہستی پر انسانی فکر کی طاقتِ زعیمہ سے تسخیر ہو کر انسانی منفعت کے لیے متاعِ انسانیت بنیں۔ قدرتِ کاملہ نے اپنے جملہ کلام حصول معانی کے لیے انسانوں کو عطا فرمائے۔

چنانچہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" کی آیت سے لے کر "وَالنَّاسِ" تک پروردگارِ عالم نے اپنی ذات کو منوانے کے لیے اپنی مخلوقات کے امثال بیان فرمائے اور ان کی خصوصیات پر بار بار بحث فرما کر انسانی ذہن کو جولانگاہِ فکر و نظر پر چلنے کی دعوت دی۔

حمدِ باری تعالیٰ کا تعلق حامد کے ساتھ ہے اور حمد محمود کے لیے ہوتی ہے۔ یہاں محمودِ مطلق پروردگارِ عالم ہیں اور محمودِ مطلق کا حامد انسان ہے اور حمدِ حامد کے لیے محمود کی تحمید کا ذریعہ ہے۔ حامد صاحبِ شعور ہے۔ حمد زبان سے ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زبان شعور

نہیں رکھتی۔ بلکہ شعورِ باطن کا ایک حصہ ہے۔ جس کی ترغیب پر زبان حمد بیان کرتی ہے۔ پروردگارِ عالم اپنی حمد کے لیے اپنی صفتِ خالقیت سے گزر کر صفتِ ربوبیت کا اظہار فرما کر اپنے بندے کو شعوری طور پر حمد بیان کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کا ترجمہ ہے جہانوں کو پالنے والا۔ جس میں مخلوق کے تمام انواع و اصناف آجاتے ہیں اور تمام انواعِ مخلوق پروردگارِ عالم کی تربیت سے مربوب کہلاتے ہیں یہ صفتِ ربوبیت صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ سارے جہانوں کو پالنا اور تدریج سے ان کو معراجِ کمال تک پہنچانا صرف اللہ ہی کی صفت ہو سکتی ہے۔ یہاں شعورِ انسانیہ کو دعوتِ فکر و عمل دینے کے لیے تربیتِ عالمین کی مثال پیش کی۔ یہ مثال اتنی طویل الذیل کثیر المعانی اور وسیع الحال ہے کہ اس کے طول و عرض اور عمق تک ہماری ظاہری آنکھیں، ظاہری کان ظاہری ہاتھ کسی طرح بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ان کی وسعتوں تک صرف فکرِ انسانی کی رفتار ہی پہنچ سکتی ہے۔

فی الواقع، خدا کی مخلوق میں فکرِ انسانی سے زیادہ کوئی چیز تیز رفتار نہیں چشم زدن میں فکر اَنفُس و آفاق کی سیر کر لیتی ہے۔ یہی فکر انسان کو سیر فی العلوم، سیر فی الفنون، سیر فی المعانی اور سیر الی اللہ کراتی ہے۔

فکرِ انسانی اعدامِ متقابلہ کے حالات منکشف کراتی ہے اور ان کو مختلف حالتوں میں وجود بخشتی ہے۔ دنیا میں صنعتِ انسانی جس قدر بھی واقع ہو چکی ہے۔ وہ سب کی سب مرہونِ فکر ہے۔ ہر تصورِ تخلیق فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہی تصور بعد میں انسانی صنعت میں آکر قوتِ متشکلہ اختیار کرتا ہے۔ اس کا تصورِ اولیٰ جو فکر سے نمود پاتا ہے۔ وہ تصور اصطلاحِ علمیہ میں علتِ غائی کہلاتا ہے۔ جو غیر مرئی ہوتا ہے۔ انسانی دستبرد میں آنے کے بعد وہی تصور خارج میں آکر علتِ صوری اختیار کر لیتا ہے۔

یہ جتنی مشینیں آج ارض وسما میں تہلکہ بپا کیے ہوتے ہیں۔ یہ سب پہلے فکرِ انسانی میں تصوّر کی صُورت سے نمود پانے والی ہیں۔ بعد میں عقلِ انسانی نے عالمِ خارج سے حسبِ دانش ان کو مہیا کیا۔ اور مشین کی صورت میں انسانی نظروں کے سامنے ان کو چلا کر فکر کی ہیبت انگیز کرشمہ سازی کا مظاہرہ کیا۔ انسان کے عملی گوشۂ فکر پر مرتب ہو کر آبادیوں کی صُورت میں باغ و بُستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے اسی فطری فکرِ انسانیہ کو دعوتِ عمل دی تاکہ یہ روحانی اور مادّی کائنات میں حیرت انگیز اعمال سے انسانی عقُول کو ورطۂ حیرت میں ڈال کر خدا کی صحیح کارسازی کی طرف مبذول کرا سکے۔

قرآن مجید فکرِ انسانیہ کو صحیح راستوں پر چلانے کا مدّعی ہے اور فکرِ انسانیہ اسی وقت صحیح راستوں پر چلتی ہے جب نفس کے غلیظ ہنگاموں سے اسے فطرت کی کرشمہ سازیوں کی طرف مائل کر کے بچایا جائے۔ پروردگارِ عالم نے اپنے کلامِ پاک کے ذریعہ سے فکرِ انسانیہ کو ایسے اصُول مرتّب کر کے دیے جن کی موجودگی میں وہ نفس کی مذموم عادات سے اور لاابالی خیالات سے بچنے ہی میں اپنی نجات پاتا ہے اس نے دُنیا میں ایسے اعمال تجویز کیے جو انجام کار فلاح و نجات کا ذریعہ بنتے ہیں۔

قرآن مجید کی نظر میں وہ فکر جو آگے بڑھ کر معلومات فراہم کرنے میں کوتاہی کرے۔ اس کو فکرِ نادان کے ساتھ اور اندھے پن سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ

”درحقیقت ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ ان کے سینوں میں ان کے دِل اندھے ہو جاتے ہیں۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ فکرِ دل کا اندھا ہونا ہی راہ حق میں گمراہ ہونے کا سبب بنتا ہے۔ ظاہری آنکھیں تو جملہ وحوش وطیور کے پاس موجود ہیں، مگر عقل وفکر و دانش سے محروم ہونے کی بناء پر حیوانِ مطلق کہلاتے ہیں اور انسان حیوانِ ناطق صرف اپنے شعورِ باطن کی بنا پر ہے۔

لہٰذا علیٰ وجہ بصیرت، اللہ تعالیٰ نے انسان کو علوم و فنون سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی تاکہ وہ اپنے علوم و فنونِ انسانیہ کو مزید معلومات کے ساتھ اضافہ دے سکے اور انسانیت کے لیے معلومات کا دروازہ عام کر دے۔

نتیجتہً کلامِ الٰہی کی دعوتِ فکر و عمل کرامتِ انسانیہ کا اظہار چاہتی ہے۔ اگر عالم اسباب میں انسان اپنی تحقیق سے ہیبت انگیز کارناموں کا اظہار کر سکتا ہے تو یقیناً صورتِ روحانیہ میں متقیّنہ تقویٰ کے ساتھ وہ حیران کن کرامات کا مالک بھی بن سکتا ہے۔

دنیا میں انسانی کرامات دو ہی صورتوں میں رونما ہوتی رہیں۔ جنہوں نے عقول کو حیران کیا۔ ایک معجزاتِ انبیآء اللہ اور کراماتِ اولیاء اللہ۔ دوسرے صنعتِ انسانیہ۔ صرف یکطرفہ کرامت انسانیت کو مطمئن نہیں کر سکتی۔

لہٰذا قرآن مجید اپنی اسلامی تعلیمات کے ساتھ اپنے پیروکاروں کو روحانی اور مادّی کرامات کے ساتھ آراستہ و پیراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔ انبیاء کرام علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے عالمِ اسباب میں روحانی اور مادّی وسائل سے حکمِ الٰہی کے مطابق فائدہ حاصل کرنا اسلامی تعلیمات میں داخل سمجھا ہے۔

قرآنِ مجید اور آدابِ زندگی

اگر کوئی عالمِ دین یا ولی اللہ مل جاتے تو یہ محض اللہ کا فضل ہے۔ اس سے بندگی کے آداب سیکھنے چاہئیں۔ ادب سیکھنے کے لیے توسّل جائز ہے۔ لیکن بے ادب اور بے دین ہونے کے لیے نہیں۔ اگر کسی ولی اللہ کا دامن اس لیے پکڑا جائے کہ احکامِ خداوندی نہیں بجا لائیں گے تو پھر بھی وہ بخشوا دے گا تو یہ سراسر غلط ہے۔ شریعت میں اس کی شدّت سے ممانعت کی گئی ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ط

یہ دُنیا سرائے فانی ہے اور اس سرائے فانی میں جو لوگ بھی اللہ کے فضل سے تشریف لاتے وہ سب کے سب محتاج تھے اور جو اب موجود ہیں اور جو لوگ آئیں گے وہ سب محتاج ہوں گے۔

خالقِ فطرت نے اپنی منشاء کے مطابق ذوالحیات پر احتیاج کو مسلّط کیا ہے اور اس احتیاج کا منشاء یہ تھا کہ اللہ کے سوا کوئی بھی معبود ہونے کا دعویٰ نہ کر سکے اور کسی طرح بھی معبُود نہ بن سکے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی مشابہت نہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ سب جہانوں کا بادشاہ ہے۔ سارے جہاں اس کی ملکیت ہیں۔ سارے جہانوں کے مکیں اس کے مملوک ہیں۔

اَللّٰہُ احکم الحاکمین ہے۔ اس نے اپنی مرضی سے کائنات کو پیدا کیا۔ اپنی مرضی سے زندگانیاں عطا کیں اور اپنی مرضی سے صُورتیں اور سیرتیں تخلیق فرمائیں عقلوں کو حیران کر دینے والا یہ سارا تماشائے عالمین اسی کا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں ان محتاجوں، غرض مندوں اور ہر قسم کا احتیاج رکھنے والوں کو استعانت کا صحیح طریقہ سکھایا ہے اور مومنین سے خطاب فرمایا گیا ہے۔

"اے فطری تعلیمات کے حامل مُسلمانو! تم اس بات کو سمجھ سکتے ہو کہ انسان محتاج ہے۔ تم تو اس کے سامنے سربسجُود ہونے والے ہو۔ تمہارا ایمان ہے کہ تم اس کے محتاج ہو۔

اس واسطے تمہیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ تم بھی خدا سے استعانت چاہو، تو اس طرح چاہو۔
یہ امر ہے اور جمع کے لیے بولا گیا ہے۔ اور جمیع المومنین سے خطاب ہے۔ اس سے ایک یا چند مسلمان نہیں، ساری ملتِ اسلامیہ مراد ہے یعنی اے سب مومنو! اللہ کی ذات پر ایمان رکھنے والو! مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ صبر کے ساتھ اور نماز کے ساتھ مدد مانگو۔ کیونکہ دُنیا دار آلام اور دار الآشوب، دار المحن، دار الاغمام ہے۔ یہاں پریشانی اور غم آزمائش کے طور پر دیے جاتے ہیں اور بیماریاں آزمائش کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔

آشوب آزمائش کے طور پر ڈالے جاتے ہیں۔ انسانیت ہر دور میں مبتلائے آلام رہی ہے اور رہے گی۔ اگر کوئی انسان اس دُنیا میں رہ کر چاہے کہ غم سے نجات پائے اور اس سے بے تعلق رہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ نوزائیدہ بچہ اس دنیا میں آکر سب سے پہلے روتا ہے۔ اس کی سب سے پہلی صدا اس کا غم ہے وہ غم و آلام سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کی بصیرت نارسا ہوتی ہے، فہم نارسا ہوتا ہے لیکن اس کی فطرت رسا ہوتی ہے۔ وہی اس کو رُلاتی ہے۔ اس کی فطرت اس بات کا احساس رکھتی ہے کہ جس مقام پر ڈال دیا گیا ہے اس کی مسافت اور منزل میں غم و الم ہے۔

قربان جائیں تعلیماتِ مصطفائیؐ پر کہ وہ سب کی سب عینِ فطرت ہیں۔ دُنیا مومنوں کے لیے گھر نہیں، بلکہ قید خانہ ہے اور منکرینِ حق کے لیے جنت ہے۔ دنیوی تعلیمات کی رُو سے یا نفسانی تعلیمات کی رُو سے نہیں بلکہ شریعت کی روشنی میں آخری نبیؐ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمی تعلیمات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہ دُنیا دار فانی ہے۔ اس کو دار الفراق قرار دیا گیا ہے۔ جہاں کوئی شخص ہمیشہ قیام نہیں کر سکتا۔ یہ قید خانہ ہے۔ یہاں طرح طرح

کی پابندیاں ہیں۔ یہ ایسا دامِ تزویر ہے جہاں محبت بھی ہوتی ہے۔ فراق بھی ہوتا ہے۔ یہاں کوئی شخص اپنی محبت کو دُنیوی طور پر پورا نہیں کر سکا۔

دُنیا میں سب سے بڑا مقام بادشاہی سمجھا جاتا ہے۔ شہزادوں اور شہزادیوں کو بڑے نازونعم سے پالا جاتا ہے۔ قصرِ شاہی میں آرام و آسائش کی ہر چیز جو روئے زمین پر میسر آسکتی ہے مہیا کی جاتی ہے ان کے عشرت کدے اور آئینہ خانے نوادرات عالم سے سجائے جاتے ہیں جہاں جلالِ شاہی تمکنت آرا ہوتا ہے اور جمالِ شاہی آرام کرتا ہے وہاں پہرے لگائے جاتے ہیں اور ان کی ہر طرح حفاظت کی جاتی ہے۔ وہاں غربت کا گزر تک نہیں ہوتا۔ وہاں کی زندگی مصائب سے ناآشنا ہوتی ہے، لیکن جب وہاں موت آتی تو اس کو پہرے دار نہ روک سکے۔ سارے جہاں کا دبدبہ اور سطوت شہزادوں اور شہزادیوں کو موت سے نہ بچا سکا۔ ساری زندگی کا جمع شدہ مال و متاع اور ازوقہ زیست موجود ہے لیکن مسرت کدے ماتم کدے بنے ہوئے ہیں اور خوشیوں کی جگہ غموں نے لے لی ہے۔ جب موت آتی ہے تو خوشیوں کو یکمشت لُوٹ لیتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہم دارالاغمام، دارآلام اور دارالفراق کے مسافر ہیں۔ جہاں باپ اور بیٹے میں پیار ہوتا ہے، لیکن خدا تعالیٰ کا قانون ان کے درمیان فرق ڈالتا ہے۔ ماں اور بیٹی میں بہت محبت ہوتی ہے لیکن انہیں بھی جُدا کر دیا جاتا ہے۔ میاں اور بیوی ہمدم زندگی ہوتے ہیں لیکن وہ بھی الگ کر دیے جاتے ہیں۔

قانونِ قدرت کی بہت سی کیفیات، تمہاری آنکھوں سے اوجھل اور مستور ہیں۔ تم بچوں سے، امارت سے، علم و ہنر سے اور زمان و مکان سے کھیلتے ہو، لیکن تمہیں اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی کہ ایک لمحے بعد کیا ہونے والا ہے۔ زمین و آسمان میں کیا ہونے والا ہے۔

لیکن اسلامی تعلیمات نے تم کو باخبر کر دیا ہے کہ تم کچھ بھی نہیں ہو۔ تمہاری یہ زندگی فانی ہے۔ اور تمہارے یہ کھیل اُدھورے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ دُنیا مسلمانوں کا گھر نہیں ہے۔ یہ تعلیم کس قدر عالم ہست و بود کے مزاج اور وجودِ خاکی کی فانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ تمام علوم اور مابعد الطبیعات کا خلاصہ یہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے جو اس پر ایمان لائے اس کو وحدہٗ لاشریک تصوّر کیا۔ اپنے آپ کو محتاج جانا، اس کو غنی کہا۔ اپنے آپ کو بندہ اور اس کو احکم الحاکمین مانا، خطاب فرماتا ہے کہ تم صبر کے ساتھ اور نماز کے ساتھ استعانت طلب کرو۔ اے دارالمحن کے مسافرو! تم استقامت اور صبر کے ساتھ کام لو۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اگر تم استعانت چاہتے اور رضائے الہٰی کے طلبگار ہو۔ تو سب سے پہلے تمہاری نیّت میں استقامت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر تمہاری نیّت میں تذبذب ہو، تو اپنی مراد تک نہ پہنچ سکو گے۔ تم اللہ سے امداد طلب کر رہے ہو۔ اگر تم پر کسی قسم کا غم یا مصیبت ہے، تم بیمار ہو یا کوئی احتیاج رکھتے ہو تو اللہ کو اللہ سمجھتے ہوئے اس کے حضور میں حاضر ہو جاؤ۔ اپنی نیت کو مستقل کرو۔ تمہارے پاس ایمان موجود ہے اس پر استقامت حاصل کرو۔

اگر تمہارے اُوپر کسی قسم کا خارجی، نفسانی یا عقلی دباؤ ہے تو اس کو ختم کر دو کیونکہ خارجی دباؤ کبھی تمہارے لیے نفع بخش ثابت نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے سوا کوئی خارجی قوّت تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ اس لیے جتنے قسم کے دباؤ تمہاری طبیعت پر ہیں ان کو دُور کرو اور صبر کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے اللہ کے حضور میں حاضر ہو جاؤ۔ یہاں تک صبر کا ذکر ہے اس کے بعد نماز کا ذکر آتا ہے۔

نماز اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد نیت سے شروع ہوتی ہے — بدن اور

لباس کی پاکیزگی اور اپنے ارکان سے متعلق ہوتی ہے۔ یہ اظہارِ عبودیت ہے اور گردشِ لیل ونہار کے پانچ اہم اوقات میں نیت سے اس کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس آدمی کی نیت متزلزل ہو، وہ مکمل وضو نہیں کرسکتا۔ اس کی نماز درست نہیں ہوسکتی۔ اس واسطے فرمایا کہ پہلے تم صبر کو اپناؤ، پھر نیت میں استقلال پیدا کرو۔ اور نماز قائم کرو اور اسے پورے ارکان کے ساتھ ادا کرو۔ اس کے بعد خدائے لم یزل کے حضور میں صبر و استقامت کے ساتھ استعانت طلب کرو۔

ایسا صبر ایسی استقامت اور ایسی نماز بے حد دشوار ہوتی ہے۔ اِلَّا عَلَی الخَاشِعِین، مگر خاشعین پر، یہاں خاشعین کو تذبذب اور تزلزل سے مستثنیٰ فرمایا گیا ہے۔ یعنی سوائے اہلِ ایمان کے، دوسرے لوگ ایسا نہیں کرسکتے۔ ان کے لیے یہ حالت بہت گراں ہے۔ ہمہ وقت اللہ سے ڈرنے والے اور اس سے اُمید رکھنے والے ہی ایسا کرسکتے ہیں۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کسی کو کوئی تکلیف پہنچے یا غربت مسلّط ہو جائے یا کوئی بیماری آگھیرے تو وہ اللہ کے حضور فریاد کرتے ہیں لیکن جُوں جُوں دولت مند ہوتے جاتے ہیں یا مصائب سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ اللہ کو فراموش کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کی نظر میں غربت اور امارت یکساں ہیں۔ عنداللہ ساری کائنات غریب ہے جو انسان حادثات کا شکار ہو جانے والے ہوں۔ گر کر ٹوٹ سکتے ہوں۔ پانی میں بہہ سکتے ہوں۔ آگ میں جل سکتے ہوں اور موت کا شکار ہونے والے ہوں۔ سب عاجز ہیں۔

اہلِ ایمان خاشعین، راحت اور غم دونوں میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اس واسطے کہ وہ اہلِ صبر اور استقامت والے ہیں وہ ارکان الصّلوٰۃ سے باخبر ہوتے ہیں اور وہ ہمہ وقت

اللہ کے حضور میں ظاہر و باطن سے حاضر رہتے ہیں۔

خاشعین کون ہیں ؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کا خوف رکھتے ہیں اور محبت رکھتے ہیں۔ وہ ریا کار یا فریبی نہیں ہوتے۔ وہ شعائر اللہ کے سخت پابند ہوتے ہیں۔ وہ ایمان والے لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کا بھی یقین رکھتے ہیں کہ ان کو خدا کے رُوبرُو پیش ہونا ہے اور حساب دینا ہے۔

یاد رکھو انسان کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یقیناً سب کو اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے جو اسے تسلیم کرتے ہیں وہ بھی اور جو نہیں کرتے وہ بھی اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ ظالم و مظلوم، گنہ گار و بے گناہ سب اس کے حضور حاضر ہونگے۔ اور انبیاءؑ و اولیاءؒ، شاہ و گدا سب حاضر کر دیے جائیں گے اور انصاف کے دِن اللہ کے سوا کوئی بادشاہ نہیں ہوگا اور اس دِن کسی کو کوئی اختیار نہیں ہوگا۔

چنانچہ اللہ نے سارے ذی جانوں کے لیے فرمایا:-

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ط

"ان سب کو جو ذی جان مخلوق ہیں، موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے۔"

استعانت بالصبر والصّلوٰۃ کی تفسیر کے ضمن میں فرمایا۔ استقلال رکھنے والے اور مصائب پر صبر کرنے والے اور اللہ کے حضور میں نماز پڑھنے والے ہیں۔ اگر تم بھی اللہ سے استعانت چاہتے ہو تو اپنی نیتوں کو پاک و صاف کرو اور ایمان پر استقامت حاصل کرکے صبر سے کام لیتے ہوئے خوشی و غم میں اظہارِ عبودیت کرتے ہوئے اپنے مالک و مولا کے سامنے نماز کے ساتھ حاضر ہو جاؤ۔ وہ تمہاری ضرور مدد کرے گا۔

نیّت کی مثال بیج کی مانند ہے۔ اگر بیج صحت مند ہو تو اس کا درخت اور اثمار سب صحت مند ہوں گے۔ کسی مومن کی نیّت ٹھیک ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ احکامِ الٰہی پر عمل پیرا نہ ہو۔ جب وہ امر و نہی پر صحت نیّت سے پابند ہو گا تو اس کے اعمال زندگی بھی صحت مند ہوں گے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسولؐ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز کا شوق رکھتے ہیں۔ پھر بھی ہم سے نماز نہیں پڑھی جاتی۔ آج یہ روش عام ہو گئی ہے۔ میں نے اکثر نوجوانوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ اللہ اور رسولؐ، قرآن مجید اور یومِ آخرت پر ہمارا ایمان ہے اور اسلام سے ہمیں محبت ہے، لیکن ہم سے نماز نہیں پڑھی جاتی۔

یہ کیسا ایمان اور کیسی محبّت ہے جو اپنے نتائج ایمان کو برآمد نہیں کر سکتی۔ کھیت سے محبّت رکھنے والا دہقان اگر کڑکتی دھوپ میں محبت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ تو خُدا سے محبت رکھنے والا کیونکر نماز سے جُدا ہو سکتا ہے۔ دہقان کو جب معلوم ہوتا ہے کہ زمین فصل پیدا کر سکتی ہے اور اس سے منافع میسّر آ سکتا ہے تو شدت کی گرمی اور سردی میں لگاتار محنت کرتا ہے۔ اس کو یقین کامل ہوتا ہے کہ نتیجے میں اسے فصل میسّر آئے گی۔ بازاروں میں جا کر دیکھیے تاجر صبح و شام دولت کی نماز پڑھتے ہیں یعنی وقت پر حاضری اور لگاتار محنت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دولت کو عزیز رکھتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے اس سے غفلت پسند نہیں کرتے۔

جب لوگوں کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ فلاں مقام پر نفع ہے۔ تو سب وہاں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب کی عقل، علم و ہنر منافع گاہوں پر حاضر ہیں۔ حتیٰ کہ نوجوان اور

بوڑھے، عورتیں، مرد، خاص و عام تلاشِ منافع میں مصروف ہیں۔ اور یہ سب طالبانِ دنیا خشوع اور خضوع کے ساتھ حصولِ زر کے ارکان کو پوری طرح بجا لاتے ہیں اور اس میں دیدہ و دانستہ کوئی فروگزاشت نہیں کرتے کہ مبادا نقصان ہو جائے۔ بکثرت اہلِ دنیا قطار در قطار، فوج در فوج، قافلہ در قافلہ دولت کی طرف جا رہے ہیں کیونکہ ان کو یقین ہے کہ دولت سے نفسانی خواہشات پوری ہوتی ہیں اور اس پر وہ استقامت حاصل کرتے ہیں۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ اوامر و نواہی ان ہی کے مفاد کے لیے ہیں تو پھر ان سے نماز کیوں نہیں پڑھی جاتی۔ معلوم ہوا ایمان تو ہے لیکن مستحکم ایمان نہیں ہے۔ نیت تو ہے مگر متزلزل خوف و رجا تو ہے مگر ناقص کلامِ الٰہی سے ان کے قلوب صحیح معنوں میں متاثر نہیں ہیں۔ ان کو اللہ، رسولؐ اور اسلام سے ویسی محبّت نہیں جس کے وہ مدّعی ہیں۔

اگر وہ اپنے دعوؤں میں سچے ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ نماز نہ پڑھتے اور روزہ نہ رکھتے۔ زکوٰۃ نہ دیتے اور حج نہ کرتے اور یتیموں کی خبرگیری نہ کرتے۔ پڑوسیوں کا حق ادا نہ کرتے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کے اندر خدا ترسی نہ ہوتی۔ پڑوس میں کسی کی بیوی بیوہ ہو سکتی ہے۔ کسی کے بچّے یتیم ہو سکتے ہیں، کسی پر غربت مسلّط ہو سکتی ہے تو کیا اس پر یہ تصوّر نہیں کیا جا سکتا کہ سب کی بیویاں بیوہ ہو سکتی ہیں سب کے بچے یتیم ہو سکتے ہیں اور غربت و افلاس سب پر مسلّط ہو سکتا ہے۔

یہ کیسی خدا ترسی ہے کہ کسی کے پالتو جانوروں کو صحت بخش غذائیں ملیں اور غریب پڑوسی کا بچّہ دوا سے بھی محروم رہے۔ کس مپرسی کے عالم میں بلک بلک کر مر جائے۔

بے کسوں اور ناداروں کو طرح طرح کے امراض چمٹیں اور غربت کی وبائیں نازل ہوں ان کی مائیں آنسو بہانا چاہیں، مگر بہا نہ سکیں۔ شدتِ آلام سے ان کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو جائیں۔

مائیں سب کی یکساں ہوتی ہیں جس طرح ایک بے کس بچے کی ماں رو سکتی ہے۔ اسی طرح ایک شہزادے کی ماں بھی رو سکتی ہے۔ ایک غریب بچے کا باپ کیا کچھ تمنائیں نہیں رکھتا۔ کون سا ایسا باپ ہے جو اپنے آلِ اولاد کو خوشحال نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگر کسی کے دل میں یہ تصور اور خشیت پیدا ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خالص عبادات اور معاملات کے ساتھ راضی نہ کرے۔

اس دارالمحن میں انسان خوشی کی تلاش میں سراب کی چمک سے دھوکہ کھاتا ہے۔ چند مجازی چیزیں اس کے ہاتھ میں آجاتی ہیں تو وہ ان سے بہل جاتا ہے۔ لیکن خوشی پھر بھی اسے میسّر نہیں آتی۔ طمانیت قلب و نظر سے وہ پھر بھی دُور رہتا ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت سے دُور رہتا ہے۔ اس کی فریب خوردگی کا یہ عالم ہے کہ وہ کہیں سے یہ سُن پائے کہ دُنیا کے کسی حصّہ میں کسی نے کوئی چیز ایجاد کرلی ہے تو حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن وہ نہیں سوچتا کہ گردشِ لیل و نہار کا ایسا تحیّر خیز عمل اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اس کی بُنیاد کس حقیقت پر ہے۔ نظامِ تخلیق کی ابتدا کیوں کر ہوئی۔ تکوینِ کائنات کا مقصد کیا ہے مسلمانوں پر یہ ضروری ہے کہ ایسے بنیادی مسائل پر غور و فکر کریں۔

آتش و آب و باد و خاک، نظامِ تخلیق کے بنیادی عناصر ہیں۔ انسان ان میں سے کوئی چیز آج تک نہ بنا سکا۔ زندگی اور موت بنیادی مسائل ہیں۔ کوئی انسان ان میں سے کسی ایک کا بھی خالق نہ بن سکا۔ اور نہ موت پر قابو پا سکا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے

شب و روز تغیرات ہو رہے ہیں اور بنیادی مسائل پر زندگانیوں کو باقاعدہ تفرعات میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ زندگانیاں واپس لی جاتی ہیں اور نئی زندگانیاں روزانہ دی جا رہی ہیں لیکن کوئی ان محیر العقول کاموں سے متحیر نہیں ہوتا۔ تحیر انگیز حالات تو پہلے ہی موجود ہیں جو دعوتِ حق دیتے ہیں لیکن تم انسانی تخلیق پر متحیر ہوتے ہو اور خالق کائنات کی تخلیق پر تعجب نہیں کرتے۔ یہ کوتاہ بینی، سوءِ الادبی اور آدابِ زندگی کے منافی ہے۔

دراصل تمہاری نیت کو بہت سی خارجی قوتوں نے لوٹ لیا ہے۔ کہیں دولت کہیں طاقت، کہیں عارضی حسن اور کہیں ادھورے علم نے لوٹا ہے۔ اکثر لوگ مجاز کا شکار ہو گئے ہیں لیکن یہ یقینی بات ہے کہ لوگوں میں نیکی کی صلاحیت موجود ہے۔ اسے ایمان کے سوزِ دروں سے حرارت کی ضرورت ہے۔

جب ایمان پختہ ہو جائے گا اور اس میں استقامت پیدا ہو جائے گی تو سارے خارجی دباؤ ختم ہو جائیں گے۔ اور یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ساری کی ساری مخلوق و کائنات اس کے اشاروں کا کرشمہ ہے اور اسی کے حسن کا پرتو ہے اور یہ اسی کے مظاہر ہیں۔ وہ ہمارا معبودِ مطلق اور دستگیر ہے۔ دستگیر وحدہٗ لاشریک ہے۔ ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اسی سے پناہ مانگتے ہیں اور اسی سے استعانت کے طلبگار ہیں۔ وہ مستعانِ حقیقی ہے۔

دنیا کی کوئی طاقت، خواہ وہ لطیف ہو یا کثیف ہو غیر مختار ہے۔ مختارِ حقیقی خداوند ذوالجلال ہے۔ لوگوں کو اسی کو مختار جاننا چاہیے۔ اسی کی عبادت کریں۔ اسی کے حضور میں حاضر ہو کر فریاد کریں۔ جب وہ راضی ہو جائے گا تو خود بخود اسباب پیدا ہو جائیں گے۔ لوگوں میں سے عالم و فاضل، ولی، حاکم، عام و خاص بھیج کر تائید فرمائے گا۔

یہ اللہ کی مہربانیاں ہیں، کوئی اُنہیں سچّے دِل سے تلاش کرتا ہے تو مِل جاتی ہیں۔ قانُونِ قدرت کے تحت اسباب پیدا ہوتے ہیں جن سے کام نکل آتے ہیں لیکن اسباب اور مسبب الاسباب میں تمیز پیدا کر دینا ضروری ہے۔

اگر کوئی عالمِ دین یا ولی اللہ مِل جائے تو یہ محض اللہ کا فضل ہے۔ اس سے بندگی کے آداب سیکھنے چاہئیں۔ ادب سیکھنے کے لیے توسّل جائز ہے۔ لیکن بے ادب اور بے دین ہونے کے لیے نہیں۔

اگر کسی ولی اللہ کا دامن اس لیے پکڑا جائے کہ احکامِ خداوندی نہیں بجالائیں گے پھر بھی وہ بخشوا دے گا تو یہ سراسر غلط ہے۔ شریعت میں اس کی شدّت سے ممانعت کی گئی ہے۔

اہلِ اللہ کے پاس اس واسطے جانا چاہیئے کہ بندگی کے آداب حاصل کیے جائیں۔ بھیجنے والے نے ولی اللہ کو منافع بنا کر بھیج دیا ہے۔ جس طرح ایک درخت ثمر کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ حالانکہ وُہ مختار نہیں ہے کسی طاقت نے اسے ثمر لوگوں کے کھانے کے لیے عطا فرمائے ہیں جن سے استفادہ ثواب ہے اور اس سے انکار کفرانِ نعمت ہے۔ کوئی ثمردار درخت مِل جائے تو اس کے اثمار ادب سے کھائے جائیں، مگر ان کی پرستش نہ کی جائے۔

ماں باپ پرورش کے لیے اسباب ہیں معبُود نہیں ہیں۔ عالمِ دین، ولیٔ وقت، اور حاکم معبُود نہیں بلکہ اسباب ہیں۔ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ نے جو نعمتیں پیدا کی ہیں ان سے استفادہ کرو۔ نیکوں اور نیک بندوں سے استفادہ کر کے اللہ کی طرف رجوع کرو۔ نعمتیں اس واسطے ہیں کہ ان سے استفادہ کرنے کے بعد روحانی اور جسمانی قوت نصیب ہو، تاکہ اہلِ وسیلہ اللہ کی عبادت اور مخلوقات کی خدمت کر سکیں۔ لہٰذا نذ

اس واسطے ہیں کہ ان سے جائز اور حلال طور پر استفادہ کر کے انسانیت کی خدمت کی جائے۔ یہ ایک طریقۂ تشکر ہے۔ اس طرح علمائے دین اور اولیائے کرام اہل جہاں کے لیے ایک سایہ عاطفت ہیں۔ انہیں کچھ توفیقات دی گئی ہیں اور یہ ہر انسان کو بالعموم اور مومن کو بالخصوص دی جاتی ہیں جو ان کا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے۔

اولیاء اللہ اس کے معترف ہیں کہ یہ تفویضاتِ الٰہیہ ہیں اور اللہ نے جو کچھ دیا ہے اس سے انتفاع چاہتے ہیں۔ ان کے سائے میں بیٹھ کر روحانی قوت اور بصیرت حاصل کی جائے۔ اور اللہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ ستم رسیدوں، دردمندوں، یتیموں، دریدہ حال غریبوں اور بیواؤں کی سرپرستی اور خدمت سے اللہ کی رضا جوئی کو حاصل کیا جائے۔ رفتہ رفتہ قلب طمانیت حاصل کرتا جائے گا نیت اور ایمان میں استقامت آجائے گی اور زندگی کے آداب سے آشنائی حاصل ہوتی جائے گی۔

قرآن مجید اور تاریخ

اس روشنی میں قرآن مجید بندے کو حمد و ذکرِ باری تعالیٰ سے اذکارِ انبیاءؑ، اولیاءؒ سے تاریخی باب کے ابتدا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تاریخ کی یہ وُہ فطری صراط ہے جس کا آخری سِرا خدُا کی رحمتوں سے جنّت الفردوس کی راحتوں سے مِلا ہوا ہے - اتنی واضح، پُر معانی خزائن سے بھری ہوئی رحمتوں اور دونوں جہانوں کی راحتوں سے مالامال کوئی دوسری راہ نہیں ہوسکتی۔ خدُا کے تاریخی کردار نے اپنے فضل و کرم سے جن فطری خطوط پر چلنے کی دعوت دی وہ فضلِ الٰہی ہے جو انسان کو تاریخی کردار سے مالامال کرتا ہے۔

قرآن مجید خود ایسی تاریخ ہے جو ازل تا ابد تاریخ دُنیا اور تاریخ عقبیٰ پر مشتمل ہے۔ قرآن مجید کے سیاق و سباق پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کے بعد صاف طور پر وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ تاریخ ایک قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی تاریخ رُوداد اعمال پر قولِ فیصل نہیں بن سکتی۔ چونکہ اس کے غیر صحت مند ہونے کے متعلق آنے والے حالات کے مطابق تنقید کی جاسکتی ہے۔ قولِ فیصل وُہ ہوسکتا ہے جس میں قطعی فیصلہ ہو۔

قرآن مجید فیصلہ الٰہی ہونے کی حیثیت میں علم الٰہی کی لازوال اور لامحدُود نگاہوں کے ساتھ جو ازل و ابد کو اپنے سامنے رکھ کر بنائی گئی ہیں مرتّب ہوا۔ نزُول کے اعتبار سے یہ چودہ سو سال قبل نازل ہُوا۔ مگر ماضی کے تمام قصص اس میں موجود ہیں۔ تمام نیک واقعات جو برگزیدہ شخصیات سے صادر ہوئے وُہ اس میں موجود ہیں اور وہ تمام بُرائیاں جو ان لوگوں کے سامنے آئی ہیں ان سب کو اس میں بیان کر دیا گیا۔

تاریخ انسانیت اس عملی روداد زندگی کا نام ہے جو اس کے صحیح قول و فعل پر مرتب ہو کر آنے والے زمانوں کے لیے محفوظ رہے اور اُن پر ماضی کے حالات کا بالامانت ترجمہ کرے۔ اس حیثیت پر تاریخ دو حصّوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ ایک اچھے لوگوں کے اچھے اعمال کی امین ہو کر۔ دُوسرے بُرے لوگوں کی بُرائیوں کی ترجمان ہو کر سامنے آتی ہے۔ اس اچھائی اور بُرائی کو ترغیب و ترہیب کی صورت میں پیش کرنا تاریخ کے فرائض میں شامل ہے۔

اور تاریخ کا یہی فطری نصب العین ہے جس کے حصول کے لیے قومیں مجبور ہوتی ہیں۔ انسانی تاریخ کے گوشے اس وقت بھی انسانیت پر مستور نہ رہ سکے۔ جب انسانیت سراسر جہالت اور بے راہ روی کا شکار تھی۔ جن ادوار میں ظالموں نے اپنے بے جا ظلم و ستم قوت وحشت سے دبانے کی کوشش کی مگر خاموش اذہان نے ان حالات کو اپنے ذہنوں میں رکھا اور پہلی فرصت میں ان محفوظ رودادوں کو صفحۂ قرطاس پر لائے۔ اور ان نیکیوں کو جنہیں ظالموں نے اشاعت میں آنے سے روک رکھا تھا۔ وہ بھی محفوظ اذہان کی بدولت ملتی رہیں اور اس طرح ہر بھلائی اور ہر برائی جو انسانی افعال بنتی رہی۔ لامحالہ کسی نہ کسی طرح اس کو صفحۂ تاریخ پر ظاہر ہوتے کا فطرت نے موقع دیا اور آنے والے لوگوں کو ماضی کے حالات سے روشناسی ملتی رہی۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو تاریخ کا لفظ بے معنی ہو جاتا۔ اولادِ آدم کی تاریخ صرف لفظِ آدم پر لفظی طور پر مرتب ہوتی ہے۔ مگر معنوی طور پر مرہونِ اعمال ہو کر ہی تاریخ آدمیت بن سکتی ہے۔ اس تاریخ کے لیے جس مواد کی ضرورت ہوتی ہے وہ حسین و قبیح اعمال کا نام ہے۔ تاریخ جس انداز سے حالات کی تصویر کشی کرتی ہے۔ اس میں عادات، اطوار، رحم و غضب، غربت و امارت، جغرافیائی حیثیات، قوموں کے تہذیب و تمدن اور ان کی معاشرت، ان کے مذاہب ان کے ضعف و قوت، فردی اور اجتماعی زندگی، امن و صلح، جنگ و جدل فتح و شکست، خوشی و غمی، ازدواجی زندگی، شہری حقوق، رائے، عدالت، حکومت عدل و انصاف اور تعلیم و تربیت وغیرہ سب شامل ہیں۔

ہر تاریخ مرتب ہونے سے پہلے مورخین کی نظر سے گزر کر تاریخی مقام پاتی ہے۔ مورخین حتی المقدور اس کو حالات کے مطابق صحیح تاریخ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر قدرتی طور پر تاریخ کے بعض حصوں پر عصبیت انسانیہ کا رنگ آ جاتا ہے۔

چونکہ ہر قوم من حیث الجنس برتری چاہتی ہے اور ہر برتری کے لیے انہیں معیارِ شرافت مہیا کرنا پڑتا ہے جس میں انہیں فکروں کو تخلیقی صنعت دینی پڑتی ہے۔ جو انسانی کمزوری پر محمول ہوتی ہیں اور اسی صنعتِ فکری کا تحمل تاریخ کی اصلیت کو حقائق پر پردہ ڈالنے کی جسارت پیدا کرتا ہے۔ اس بناء پر تاریخ انسانیت کا ہر گوشہ شک و شبہ پر انسانی طبیعت کو آمادہ کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تاریخ خداوندی ہی کو یہ حق پہنچ سکتا ہے جو عصبیت سے مبرّا ہو کر حقیقی تاریخ کی صورت میں سامنے آئے۔ چونکہ علمِ خداوندی فیصلہ خداوندی نظر خداوندی دست بُردِ عقلِ انسانی سے مطلقاً منزہ و مبرا ہے۔

اس فطری قدر پر تاریخ مرتب ہو کر اقدارِ تاریخ کا صحیح موازنہ بن کر نظامِ تخلیق سے اپنا آغاز کرتی ہے۔ قرآن مجید کی تاریخی حیثیت اللہ کے پہلے عمل کُن سے آغاز کرتی ہے اور مَا کَانَ وَ مَا یَکُوْنَ سب کو اپنے دامن میں لیتی ہوئی ان ہی میدانوں سے گزرتی ہے۔ جو اللہ کے علم میں زیرِ نظر تھے۔

اللّٰہ کی تقدیرات قرآن مجید کے قولِ فیصل میں آجاتی ہیں۔ قرآن مجید تاریخ کائنات رَبّ العالمین کے لفظ سے حال بیان کرتا ہے۔ اور خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا فرما کر سات آسمانوں کی تخلیق بیان کرتا ہے۔ پھر آسمانوں کے اجزاء پر یوں بات کرتا ہے:۔

وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ۔

یعنی ہم نے آسمانِ دنیا کو کواکب سے مزیّن کر دیا۔ پھر اسی ترتیب سے اشیائے عالم تخلیق پر قرآن مجید تاریخی احوال بیان کرتا ہے۔ زمین کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ اس کو میں نے چھ دن میں تخلیق فرما کر آسمانوں کی طرف توجہ فرمائی۔ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ط

یعنی زمین کو چھ دن میں بنایا اور پھر آسمانوں کی طرف توجہ فرمائی۔ اور انہیں سات طبقات پر سلسلہ وار استوار کر دیا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اس کے بعد تخلیق کے مختلف گوشوں پر مختلف عنوان میں روشنی ڈالتا ہے۔ انسان کے بارے میں جب وہ عدم میں تھا اور عدم سے وجود میں لانے تک اس کی تاریخ پر بڑا حسین تبصرہ کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کا ذکر اپنی زبان میں ان تاریخی الفاظ کے ساتھ بیان کرتا ہے جو کسی دوسری تاریخ کا حق نہیں ہو سکتا۔ ذکر کرتا ہے۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝ إِنَّا
خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا
إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا

"یعنی انسان پر زمانوں میں سے ایک ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے جب یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر ہم نے اس کو ایک قطرۂ آب سے پیدا کیا اور اس کو سننے والا اور دیکھنے والا کیا۔ اس سننے اور دیکھنے کی صلاحیت کے بعد اس پر ہم نے ہدایت کی دو راہیں واضح کر دیں۔ یعنی کفر و اسلام چاہے وہ راہِ اسلام پر چلے اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرے اور چاہے کفر کا راستہ اختیار کرے اور صراطِ مستقیم سے بھٹک جائے۔"

اس تاریخ انسانیہ پر انسان کی اصلی حیثیت پیش کر کے اپنے اس انعام کا احساس دلایا جو اسے تخلیقاً سمع و بصر کی صورت میں تفویض ہوئے اور اس کو تاریخ یاد دلاتے ہوئے ہدایت پر چلنے کے لیے مکلف قرار دیا۔ اور کفر و اسلام کے نفع و ضرر سے آگاہ کرنے کے بعد کہ اسلام میں تیری نجات ہے اور انکار میں تیری ہلاکت۔ اس افہام و تفہیم کے بعد انسان کو

ان دونوں راہوں میں سے ایک راہ انتخاب کرنے کا اختیار دیا گیا۔ جس کا مطلب دیدۂ دانستہ راہ مہیا کرنے کا آتا ہے۔ اس تاریخی بیان میں انسان کو انتخابِ راہ کے لیے امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ تاکہ اس کی عقل کا اس کے انتخاب سے اندازہ کیا جائے کہ کیا وہ اپنی تاریخی حیثیت کے پیشِ نظر عقل سے کام لے رہا ہے یا نہیں۔

چونکہ انتخابِ شے، اس کی تاریخی حیثیت کا ترجمان ہوتا ہے کہ وہ عقلِ سفلی سے کام لیتا ہے یا عقلِ علوی سے۔ اس لیے اللہ نے اسے احسن تقویم کے ساتھ علوِ درجات بخشا ہے۔ انسانی تاریخ اسے اعلیٰ کام کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ قرآن مجید تاریخ الٰہی اسی کی ذات کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس کو مخلوق سے منزہ قرار دیتے ہوئے اس کی صفات بیان کرتا ہے۔ تاریخ عمل خداوندی صفاتِ باری تعالیٰ کی مظہر ہے۔ کائنات کے جملہ خد و خال حسنِ قدرت کو نمایاں کرنے کے لیے صحیفہ کی صورت میں تاریخ اعمالِ خداوندی مرتّب کرتے ہیں۔ اور سنّتِ اللہ کو بیان کرتے ہوئے فطرتِ خلق پر مرتّب کرتے ہیں۔ یہ تاریخ کی ترتیب تجویزِ خداوندِ ذوالجلال ہے۔

اس تاریخ کے پیشِ نظر اس کے بیان کردہ ایک مچھر سے لے کر بڑی سے بڑی چیز تک مطالعہ کرنے سے تاریخ کے بیان اور زیرِ مطالعہ چیز میں سرِ مو فرق نظر نہیں آتا جس سے قرآن مجید کے ازلی اور ابدی تاریخ ہونے میں باشہادت تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ

"یعنی اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں ایک مچھر جیسی چھوٹی مخلوق سے لے کر سارے جہانوں کی مثال پیش کرنے سے قطعاً شرم محسوس نہیں کرتا۔" اس آیت میں تاریخ اشیائے عالمین

پر اتنی عمیق اور وسعت طلب روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس میں ایک مچھر جیسی چھوٹی دُنیا کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ کوئی دنیا کا مورخ قومی سطح پر من حیث الجنس کسی حقیر واقعہ کو سطح تاریخ پر لانا پسند نہیں کرتا اور چھوٹے واقعات کو بیان کرنا کسرِ نفسی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس سے چھوٹی چیزیں محروم الذکر ہو کر مفقود عن المطالعہ ہو جاتی ہیں۔ یہ تاریخ کا ذاتی نقصان ہوتا ہے مگر یہ شان پروردگار عالم کی کتاب کو میسّر آئی کہ وہ تاریخ تخلیق میں ہدایت انسانیہ کے لیے کبریا کے کلام سے ایک حقیر سے حقیر چیز کو ہر زمانہ میں انسانیت کے سامنے آنے کا موقع دیتی ہے۔

قرآن مجید نے تبشیر و تنذیر کی صورت میں جس طرح قدرت خداوندی پر بحث کی ہے اور جس طرز بیان سے وہ ماضی کے احوال پر بات کرتا ہے۔ وہ طرز اس قدر جدّت پسند ہے کہ کوئی عقل اس کی تسخیر دعوت سے بچ نہیں سکتی۔ اسی واسطے اس صحیفۂ خداوند ذوالجلال کو قولِ فیصل کی حیثیت میسّر آتی ہے۔

سارا قرآن مجید تاریخ کا ترجمہ اعمال پر مرتب کرتا ہے اور اس کا منشاء ایسے اعمال کی ادائیگی ہے جو ہمہ وجوہ احسن ہوں۔ اور ان اعمال کا حسن انسانیت پر اس طرح طلوع ہو کہ انسانیت کی قباحتیں سائے کی طرح الگ ہو جائیں۔ عالم تمثال میں جس طرح سورج کی شعاعیں جسم کو سائے سے الگ کر دیتی ہیں۔ اسی طرح احسن اعمال کی تابناکی انسانی گناہوں کو سائے کی طرح الگ کر کے انسانیت کو بچنے کی ترغیب دیتی ہے:

چنانچہ قرآن مجید نے اپنی ازلی تاریخ ہونے کی گواہی اپنے رسولؐ کے سامنے اس طرح دی۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ،

"یعنی ہم نے اس الہامی کتاب کے ذریعے تجھ پر نیک لوگوں کے یعنی انبیائے کرام کے

تاریخی واقعات بیان کیے ہیں۔ اس آیت میں "نقص" اور "قصص" کے ساتھ قرآن مجید کی ازلی اور تاریخی حیثیت سامنے آجاتی ہے اور تاریخ کا صحیح ترجمہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسانوں کے اعلیٰ کارناموں کے ساتھ ہی اعلیٰ تاریخ بن سکتی ہے۔

قرآن مجید نے تاریخ مرتب کرنے کے لیے انسانوں کو اعلیٰ کارناموں کے ادا کرنے کی تعلیم دیتے ہوئے ان کی مجموعۃً "تجویز پیش بھی کردی۔ قرآن مجید اعمال کا انتخاب کرتا ہے۔ تاریخ کا بیان کرنا اور ساتھ ساتھ اعلیٰ اعمال کا انتخاب کرنا تاریخ کے نصب العین میں داخل ہے جو تاریخ انسانی احوال، اقوال، اعمال بیان کرتی ہے اس کا منشائے وحید انسانوں کو ان اعمال پر چلنے کی دعوت دینا ہے۔

قرآن مجید نے تاریخ کا عملی ترجمہ سُنّت اللہ، سنّتِ انبیاءؑ اور سنّتِ صالحین پر کیا ہے تاکہ تاریخی نظریات کا مطالعہ کرنے والے تاریخی احوال کو اپنے جسم و جان پر منطبق کرتے ہوئے صحیح راہ پر آسکیں۔ اس ضمن میں اس نے عملِ خداوندی کا انعامات کے طور پر ذکر کیا۔ عقلِ انسانی کو اور دسترخوانِ انسانیت کو نعمتِ خداوندی پر محمول کیا اور فرمایا کہ تم ان تاریخی انعامات کو اللہ کی دین سمجھتے ہوئے اللہ کے احکام کی تعمیل کرکے نیک بنو۔ اور نیکی کی راہ کھولو۔ ہر بدی کو عملِ صالح سے مٹاؤ۔ اور لوگوں کو اعمالِ شنیعہ سے بچاؤ۔ تاکہ انسانیت بھلائی کو حاصل کرتی ہوئی، بُرائی سے بچتی ہوئی، مجموعی طور پر نیکیوں پر تاریخ بنی نوعِ انسانیت مرتب کرسکے۔

اس روشنی میں قرآن مجید بندے کو حمد و ذکر باری تعالیٰ سے اذکارِ انبیاءؑ و اولیاء سے تاریخی باب کے ابتدا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تاریخ کی یہ وہ فطری سرا ہے جس کا انتہائی سرا خدا کی رحمتوں سے جنت الفردوس کی راحتوں سے ملا ہوا ہے۔ اتنی واضح،

پُرمعانی خزائن سے بھری ہوئی، رحمتوں اور دونوں جہانوں کی راحتوں سے مالا مال کرنی دوسری راہ نہیں ہوسکتی۔ خدا کے لازوال کردار نے اپنے فضل و کرم سے جن فطری خطوط پر چلنے کی دعوت دی۔ وہ فضلِ الٰہی ہے جو انسان کو تاریخی کردار سے مالا مال کرتا ہے۔

قرآن مجید نے انبیاءؑ کے ذکر کو "احسن القصص" فرمایا ہے۔ یعنی بہترین اعمال کا ذکر۔ آدم علیہ السّلام سے لے کر خاتم النبیّین محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم تک "احسن القصص" کو درجہ بدرجہ تاریخی نوعیت پر چلاتے ہوئے تکمیل بخشی۔ یہ تکمیل تاریخ اس دن مکمل ہوئی جس دن فرمایا گیا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط

"یہ قرآن مجید کی آخری آیت ہے جس میں ذکر فرمایا کہ میں نے آج کے دن آپؐ کے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو آپؐ پر پورا کر دیا اور میں آپؐ کے دینِ اسلام سے راضی ہوا۔"

اس آیت میں تکمیلِ دین، اتمامِ نعمت، اور رضا بالاسلام کے ساتھ تین باتوں کو پیش کیا گیا۔ دین تاریخی حیثیت سے آئینِ فطرت ہے۔ جو انسانیت کے لیے آخری ضابطۂ حیات ہے۔ ظاہر ہے کہ آئین اسی کو کہتے ہیں جو تقسیمِ عمل کرے۔ اور اس کے اعمال سطحِ فلاح پر نتیجہ خیز ہوں۔ اور اعمال سب کے سب حصولِ انعام کے لیے ہوتے ہیں۔ بلا عمل حصولِ انعام بے اصول ہے جس کا حصول رحمتِ الٰہی کے بغیر فریاد لاحاصل ہے، بلکہ محال ہے۔ اس واسطے کہ بلا عمل حصولِ انعام کی عادت ڈالنا فطرت کے قاعدہ کے خلاف ہے جو تن آسانی کی راہ کھولتا ہے۔

ہمیشہ یہی دستور مجلسِ انسانیہ میں نافذ العمل رہا کہ انعامات تحریصِ اعمال کے لیے اور اعمال حصولِ انعام کے لیے ہی کارفرما رہے۔ اسی عادتِ انسانیہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے

انعامات کو احسن القصص سے وابستہ کیا اور اسی ترکیب و ترتیب سے انعامات کی تحریص دی جس طرح دُنیا کے بادشاہ اپنے خیالات کے مطابق رعیت کو انعامات کے ساتھ تحریص دیتے ہیں اور یہی تحریص ریاستوں میں ابنائے وطن کو حکمرانوں کے مجوّزہ اعمال پر چلنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

پروردگارِ عالم نے قرآن مجید میں منعمُ مِنَ اللہ لوگوں کا ذکر ان کی تاریخی، عملی دشواریوں کے بعد کیا ہے۔ ان کے برجستہ عزائم، اور برجستہ فیصلوں کو منزلِ مقصود تک پہنچنے میں جن سختیوں کا سامنا کرنا پڑا اور جن کے جھیلنے کے بعد ان کو امامت ملی۔ ان سب کا ان کے اعمال کے ضمن میں ذکر فرمایا۔ تاکہ ان کی تاریخ کا کوئی حصّہ انسانی نظر سے پوشیدہ نہ رہے اور انسانیت صداقت کے میدان میں تسلیم کرلے کہ حصولِ انعام کے لیے اعمالِ صالحہ کا اختیار کرنا اشد ضروریات سے ہے۔

آدم علیہ السلام کی جملہ سختیوں کا ذکر کرتے ہوئے انہیں طلب حق میں سچّا ثابت کیا اور امامتِ ارضی کا حق دار گردانا۔ اسی طرح قرآن مجید نے انبیاء کا تاریخی ذکر چھیڑتے ہوئے۔ وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِبْرٰھِیْمَ ۔ وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِدْرِیْسَ کے طور پر تمام انبیاءؑ کا تاریخی ذکر اس جمیل اسلوب کے ساتھ کیا کہ ہر دل ان اعمال کی ادائیگی کے لیے دوڑو اور آگے بڑھا۔ ذکرِ جمیل میدانِ عمل میں اُکسانے کے لیے کیا جاتا ہے۔

حضور علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم نے دین الہیٰ کی وقتاً فوقتاً ترتیب دار ضرورتِ حال کے مطابق بکمال بجا آوری کی۔ دِین مضمون کے طور پر مکمل تھا۔ مگر نزول کے اعتبار سے حالات کے مطابق احکام نافذ کرتا رہا تاکہ انسان تدریجاً اس پر عمل پیرا ہو کر اس کے نافذ کردہ اعمال کا متحمل ہو سکے۔ اسی تدریج احکام کے مطابق حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے اور آپؐ کے

پیروکاروں نے دین کے اعمال کی تعمیلاً تکمیل فرمائی۔

دین مضموناً مکمل تھا۔ عمل رسول علیہ السلام سے عملاً مکمل ہوا۔ تب تکمیل دین کی بشارت ہوئی۔ اس پر عمل پیرا ہونے کی بنا پر مسلمانوں کو روحانی اور مادی تقویت کے ساتھ جو غلبہ میسر آیا اور دین و دنیا کی نعمتیں میسر آئیں۔ ان کے عوض میں انہیں دونوں جہانوں کے انعامات کے ساتھ خوش خبری سنائی گئی۔ یہ سارے انعامات تعمیلِ حکم کا درجۂ کمال حاصل ہونے پر عطا فرمائے گئے۔

ان انعامات کا ذریعہ دین اسلام تھا۔ اس کے ظاہر ہونے کے بعد عمل کے ساتھ اسے جو عزت میسر ہوئی اس سے خدا کی خوشنودی کا اظہار ہوا۔ صاحبِ آئین آئین کو دستور العمل کی صورت میں اس کے مطابق رُو بہ عمل ہونے کے لیے لاتا ہے۔ جب اس پر عمل ہو جائے تو آئین کی عزت و حرمت قائم ہو جاتی ہے۔ اور یہی بقائے دستور کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ورنہ لوگوں کی نظر میں آئین کی تکریم ختم ہو جاتی ہے اور راہِ عمل منہدم ہو جاتی ہے۔

آئین کی عملی تکمیل پر ہی صاحبِ آئین راضی ہو سکتا ہے۔ بصورت دیگر آئین اور صاحبِ آئین کی سخت توہین و تضحیک ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے تاریخی آئین کو عملی طور پر جامۂ تکمیل پہنایا جاتا تو تکمیلِ دین، اتمامِ نعمت اور رضایا اسلام کی آخری بشارت نہ مِل سکتی اور تاریخ کا ایسی حالت میں مرتب ہونا لاحاصل ہوتا۔ نااہل لوگوں کی تاریخیں ان کی نااہلیت پر محمول ہوتی ہیں۔ لکھی جائیں یا نہ لکھی جائیں وہ بدنامِ زمانہ ہوتے ہیں۔ اور دُنیا ان سے، ان کے کردار سے امان مانگتی ہے۔ ایسے لوگوں کے واقعات پر جو نااہل تھے اور میدانِ عمل میں نااہلی کا ثبوت دیا ان کو سخت سزائیں دی گئیں اور مختلف عذابوں

میں ان کو پکڑا گیا۔

تاریخ قرآن مجید ان کے ہولناک انجام کا ببانگ دہل اعلان کرتی ہے اور فرماتی ہے:
فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ "اے آنکھ والو! ان کے ہولناک انجام سے عبرت حاصل کرو، ورنہ تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔" اور اعمالِ صالحہ پر:

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ط فرمایا۔

"یعنی ان کے لیے دنیا و آخرت میں فلاح کی بشارت دیتا ہے۔ تاریخ قرآن مجید بار بار جو نصب العین پیش کرتی ہے۔ اس کو مرکزی نقطۂ نظر بناتی ہے۔ اور اس تک پہنچنے کے لیے قصدِ اولیٰ کی تعلیم دے کر رختِ سفر کے تمام آداب بتاتی ہے۔ ان منازل کے عقبات پر روشنی ڈالتی ہے۔ تمام منازلِ مقصود کی ہولناکیاں بیان کرنے کے بعد چلنے کی دعوت دیتی ہے تاکہ چلنے والے کا دل و جگر منزل کے مطابق مضبوط ہو جائے۔ وہ مضبوط دل و جگر کے ساتھ منزل حق پر چلنے کا حکم سناتی ہے اور مایوس کمزور، بے حوصلہ ناعاقبت اندیش لوگوں کو وعید سناتی ہے۔

اس لیے تاریخی وعید کا منشا تساہل اور تکاسل کو دور کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اہلِ عمل کے ساتھ ہو جائیں اور زندگی کو میدانِ عمل میں مردود العمل ہونے سے بچائیں۔ قرآن مجید نے راہِ عمل میں مردود ہونے پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ ان تماثیل اور نذارت و بشارت کے پیش نظر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ایک دوسرے پر سبقت لینے کے لیے وہ فوق الادراک قربانیاں دیں جن کا خیال کرنے سے بھی دل لرز اٹھتا ہے۔ اپنے بچوں جیسی نعمت کو اللہ کے راہ میں قربان کرنے کے لیے ہر ایک نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ایثار کا ثبوت دیا۔

یہ قرآن مجید کے تاریخی نقوش تھے۔ جنہوں نے عدالتِ اسلامیہ میں عادلِ وقت کے بچّوں کو قرآن مجید کے فیصلوں کے مطابق سزا کے لیے پیش کیا۔ قرآن مجید جہاں نیکیوں اور بدیوں کے درمیان تمیز کرنے کی اور انصاف کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہاں خلیفۃ المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے لختِ جگر، نورِ نظر، ابو شحمہ کو ایک جرم کی پاداش میں سرِ عدالت پکڑ لانے کی تحکیم کرتا ہے۔

ماضی کے خدائی فیصلے انبیاءؑ نے پیش کیے تھے جو طویل الذکر ہیں۔ قرآن مجید کے تاریخی قصص نے صحابہؓ پر عملِ رسولؐ سے ان کو واضح کیا تھا۔

ان تاریخی عملی وضاحتوں کے پیشِ نظر عشّاقِ رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلم کیونکر عمل پیرا نہ ہوتے۔ کیونکہ ان کا مزاج ہی راہِ حق پر ڈھل کر سراسر ایثار و اخلاص بن چکا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو عدالت میں جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے بچّے سے خلافِ اسلام بے حیائی کا گناہ سرزد ہوا ہے تو آپ نے قرآن مجید کے فیصلوں کے مطابق اقدام کیا جس پر ابراھیم علیہ السّلام کے اس ذبحِ عظیم کا واقعہ بھی موجود ہے کہ حکمِ الٰہی پر اپنے اکلوتے بیٹے کو جو میدانِ اولاد میں آپ کی محبّت کا متاع اوّل و آخر تھا۔ خدا کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

اس قدر صبر آزما واقعات اہلِ اطاعت کو بڑی سے بڑی قربانی دینے پر تیار رہنے میں معاونت کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے تاریخی حقائق کے پیشِ نظر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ بلا تامل اپنے گھر کی جانب تیزی سے چل پڑے اور گھر کے دروازے پر دستک دی۔ یہ دستک بظاہر خلیفۃ المؤمنین کی تھی مگر بباطن خدا اور اس کے آئین کی دستک تھی۔ خدا کے تربیت یافتہ دل و جگر کی دستک تھی۔

جلالت مآب، بندۂ ربّ، خلیفۃ المومنین کی لرزہ خیز آواز دستک کے ساتھ بلند ہوئی۔ ابوشحمہ کہاں ہے؟ اندر سے آواز آئی کہ وہ کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ دوسری جلالت مآب آواز نے طعام سے دست کشی کے لیے فرزندِ محبوب کو مجبور کر دیا۔ فرزند جانتا تھا کہ پدر کی یہ آواز فیصلہ کُن ہے۔ کوئی بات ہے جس کی عدالت ہو رہی ہے۔ دروازہ کھُلا۔ خلیفۃ المومنین گھر میں تشریف لائے سخت غیظ و غضب کی حالت تھی۔ دہشت سے در و دیوار کپکپا اُٹھے۔ فرمایا! ابوشحمہ! تیری زندگی کا یہ آخری لُقمہ ہے۔ میں تجھ کو عدالتِ خداوندی میں لے جانا چاہتا ہوں۔ تیار ہو جاؤ۔ تم ایک سخت جُرم کی پاداش میں مدعا علیہ ہو اور تمہارا مدعی فیصلۂ حق سُننے کے لیے عدالت میں منتظر ہے۔

یہ فرمایا اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے ساتھ ابوشحمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زُلفوں کو گرہ دے لی اور شدّت کے ساتھ ان کو عدالت کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ درِ عدالت پر پدر معہ اپنے پسر کے حاضر ہو گیا۔

ابوشحمہ کی مدعیہ ایک عورت تھی۔ جس کے ہاتھوں میں ایک بچہ تھا۔ اسی بچے کو عدالتِ عالیہ میں پیش کر کے اس نے مقدمہ دائر کیا تھا کہ یہ بچہ ابوشحمہ رض کا ہے۔ چنانچہ خلیفۃ المومنین رض نے اس عورت کے سامنے بلا تحقیق و تدقیق طویلہ کے فوراً اپنے بیٹے سے استفسار چاہا۔ ابوشحمہ! کیا تم اس عورت کو پہچانتے ہو۔ فرمایا! ہاں پہچانتا ہوں۔ پوچھا۔ کیا تم نے اس کے ساتھ بے حیائی کا جُرم کیا ہے؟ فرمایا۔ ہاں۔ پوچھا۔ یہ جُرم قرآن مجید کے نزدیک حدودِ اللہ کو پھاندنے کے برابر ہے۔ قرآن مجید اس جُرم کے لیے سخت سزا مقرر کرتا ہے باوجود اس حکمِ امتناعی کے تم نے حدودِ اللہ کو کیوں توڑا؟ کیا تم خوفِ الٰہی، خوفِ آخرت بھُول گئے تھے؟ پسر نے جواب دیا۔ ابّا جان! یہ گناہ حالتِ سُکر میں مجھ سے سرزد ہوا ہے،

جب کہ مجھ کو شراب پلا دی گئی تھی۔

اس مقام پر قرآن مجید کے تاریخی فیصلے سامنے آگئے۔ سُکر کی حد قرآن مجید میں یہ بیان کی گئی ہے کہ جب انسان اپنی کی ہوئی بات کو نہ سمجھ سکے۔ اس قرآنی فیصلہ کے پیش نظر خلیفۃ المومنینؓ نے پوچھا۔ کہ بیٹا! شراب کی حالت میں تم اس درجہ مخمور تھے کہ تمہیں اپنے بُرے عمل کی خبر نہ تھی، یا تم کو اپنے گناہ کا علم تھا۔ جواب دیا کہ میں حالتِ سُکر میں تھا، مگر میرا سُکر اس درجہ پر تھا کہ مجھے اپنے گناہ کا علم تھا۔

آپ نے فرمایا۔ میرے بیٹے اس حالت میں تم پر دو گناہ عائد ہوتے ہیں۔ شراب کا پینا اپنی جگہ ایک گناہ ہے اور وہ کبائر سے ہے اور بے حیائی اپنی جگہ ایک گناہ ہے اور وہ بھی کبائر سے ہے۔ دونوں گناہ حدود اللہ کو توڑنے کے مترادف ہیں۔ چونکہ اس عورت کے پاس بچّہ ہے۔ اس واسطے سب سے پہلے تمہیں بے حیائی کے گناہ کی سزا دی جاتی ہے۔ قرآن مجید کے فیصلے کے مطابق بے حیائی کا گناہ کرنے والے مرد اور عورت دونوں مستوجب سزا ہوتے ہیں۔ دونوں کو یکساں طور پر سو دُرّے مارنے کا حکم ہے۔ مگر حکم قرآن کے بموجب اسلامی فیصلے میں بچے والی عورت کو بچّے کی تکمیل کے لیے مدّت العمر کا تعیّن کیا گیا ہے۔ بچّے کی اس مدّت تک ماں کی سزا ملتوی کی جاتی ہے۔

چنانچہ عورت کو بچّے کی کفالت کے لیے چھوڑ دیا گیا اور عادل وقت نے قرآن مجید کے اس تاریخی فیصلہ کے مطابق اپنے آفتاب و مہتاب کو شرمانے والے پسر کے بارے میں حکم صادر فرمایا کہ اسے سو دُرّے لگائے جائیں۔ تمام اکابر اور حاضرین نے فریاد کی کہ یا امیر المومنین! ابو شحمہ کو معاف کر دیا جائے۔ اس کی جگہ ہماری جانیں لے لی جائیں۔ ہمارے بچّے لے لیے جائیں، مگر ابو شحمہ کو کوئی آنچ نہ آئے۔

ابو شحمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک صفت تھی کہ جب وہ قرآن مجید پڑھتے تھے، تو آپ کی آواز اور طرزِ قرأت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آواز کے مشابہ ہوتی تھی جس پر لوگ مفتون ہو جاتے تھے۔ اس صفت کو بھی پیش کیا گیا، مگر عادلِ وقت نے جواب دیا: کہ قرآن مجید مستوجب سزا کے بغیر دُوسرے کو سزا نہیں دیتا اور اس کے نزدیک چھوٹے اور بڑے انسانوں کے گناہ کا کوئی امتیاز نہیں۔ قرآن مجید اپنے فیصلے میں کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتا۔ اس واسطے کہ وہ عملی میدان میں فطری اصول پر تاریخ مرتب کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کل خدا کے حضور میں میں نے اپنا اور اپنے بچے کا حساب پیش کرنا ہے۔ اس وقت مجھے کوئی شخص کام نہیں آئے گا۔ میں اللہ کے سامنے شرمسار نہیں ہونا چاہتا۔ اس کے بعد اپنے بچے کو نصیحت فرمائی کہ بیٹا! دُنیا دارِ فانی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ادائیگی تعزیر کے بغیر میدانِ حشر میں خلیفۃ المؤمنینؓ کے بیٹے ہو کر ایسے شرمناک مجرموں کے زمرہ سے اُٹھائے جاؤ۔

ادائیگی تعزیر دُنیا میں بظاہر ایک سخت سزا ہے مگر اس کے ادا ہونے کے بعد مجرم اِسی دُنیا میں پاک ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے میرے محبوب بیٹے۔ میں تجھے اللہ کی مقرر کردہ سزا کا یعنی سو دُرّے لگانے کا حکم دیتا ہوں۔ جس میں اللہ کے نزدیک میری اور تیری دونوں کی عافیت ہے۔ تمہیں اللہ کے اس حکم کی بجا آوری کے لیے دل و جان سے تیار ہونا چاہیے۔ چنانچہ ابو شحمہ کو پوری پاکیزگی غسل کے ساتھ تیار کیا گیا۔ جلّادوں کو بُلا کر عادلِ وقت نے ان الفاظ میں حکم سنایا کہ اے جلّادو!

سَو دُرّے مارنے کا حُکم خداوندی ہے۔ یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں اللہ اور اس کے رسُول کی طرف سے قرآن مجید کے فیصلوں پر مامُور ہوں۔ اگر دُرّے مارتے میں ذرا بھی

تامل کرو تو میں تمہیں سزا دوں گا۔ اور میدانِ حشر میں تمہیں پکڑوں گا۔ قرآن مجید کے فیصلے کے مطابق تمہیں تخفیف کی قطعاً اجازت نہیں۔ لہذا پورے زور سے ابوشحمہ کے بدن پر دُرّوں کی پیہم ضربیں لگاؤ۔"

اللہ کے اس حکم مقدس کے نفاذ کے بعد تعمیل کی صُورت یوں سامنے آتی ہے کہ پدر نے اپنے سامنے سزا کے لیے پسر کو دیکھا اور حضرت ابوشحمہ کے بدن کو برہنہ کر دیا گیا۔ عزیز ترین متاعِ قلب و جگر، نُورِ نظر کا یہ سماں دل میں خدا کا خوف رکھنے والے پدرِ عادل کے سامنے ہے۔ وُہ چاہے تو اپنے حکم سے اپنے بچّے کو چھوڑ دینے کا قطعی مجاز ہے۔ مگر تعمیلِ حکم خداوندی میں مطلق العنان آمریّت کا جزواً بھی ثبُوت میسّر نہیں آتا۔ اس واسطے کہ اسلام میں عادل محکُوم خدا ہے۔ جس کو اصطلاحِ قرآن میں مامُور و محکوم خدا کا نام دیا جاتا ہے اور آمر مطلق العنان ہوتا ہے۔ وہ اپنے اوپر کسی دوسری طاقت کو مسلّط نہیں دیکھنا چاہتا۔ لہذا اس کے سب فیصلے آمرانہ ہوتے ہیں۔

قرآنی حکومت میں حاکم پر اللہ کی حکومت اور رعیّت دونوں کا دباؤ ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے فیصلے رعیّت کو اللہ کا بندۂ محکُوم ہونے کی حیثیت میں سُناتا ہے اور اپنے لیے اور رعیّت کیلئے کوئی امتیاز نہیں کرتا جس پر جمہوریت کا صحیح اطلاق ہوتا ہے آپ نے اسی خداوندی جمہوری عدالت کے سامنے پسرِ محبوب کے لیے فیصلہ کیا اور خوفِ الہیٰ کی بنا پر سامنے کھڑے ہو کر اپنے بیٹے کو دُرّے لگوائے کہ کہیں جلّاد دُرّے مارنے میں تخفیف نہ برتیں۔ چنانچہ دُرّوں کی آواز آنی شروع ہو گئی۔ دُرّوں کی ضربوں سے بدن پر انجمادِ خون ہوتا ہے۔ جس سے بہ شدّت پیاس اٹھتی ہے۔ چند دُرّوں کے بعد حضرت ابوشحمہ کو شدّت کی پیاس محسُوس ہوئی تو آپ نے ابّاجان کی طرف امید بھری نظریں اٹھا کر پکارا۔ العطش۔ العطش، العطش، ابّاجان مجھے پیاس ہے، ابّاجان مجھے پیاس ہے۔

ابّا جان مجھے پیاس ہے - ابّا جان نے جواب دیا۔ میرے پیارے بیٹے! حوضِ کوثر تمہارے قریب ہے۔ تم تعمیل خداوندی کی بجاآوری میں پیاس محسوس کرتے ہو۔ چند لمحوں کے بعد یہ تعمیلِ حکم تمہیں حوضِ کوثر سے ہم کنار کر دے گی۔ اس کا پانی پینا۔ یہاں میں نہیں چاہتا کہ تکمیلِ سزا سے پہلے تم پانی پیو۔ اسی ہیئتِ مجموعی میں ۸۰ دُرّوں تک نوبت پہنچی کہ آپ کے جسدِ عنصری سے رُوح پرواز کرگئی۔

اللہ کے عادلوں کو کتنا خوف ہوتا ہے۔ خشیتِ رّبانی کس قدر غالب ہوتی ہے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو فیصلوں کے سامنے بے بس قرار دے دیتے ہیں۔ یہی عبودیّت کا سچّا مقام ہوتا ہے۔ بعد میں بیس دُرّے نصابِ شرعیہ کے مطابق باقی تھے۔ آپ نے بعد از تدفین بیٹے کی قبر پر ان بیس دُرّوں کا باقی ماندہ حساب اپنے ہاتھوں سے انجام دیا اور بیس دُرّے ابوشحمہ کی لحد پر مار کر قرآن کا نصابِ سزا مکمل کیا۔

یہ تاریخ قرآن کا ایک عملی ورق ہے جس کی موجودگی میں خلافتِ اسلامیہ پر آمریّت کا الزام نہیں لگ سکتا۔ ایسا الزام لگانا سراسر حق سے چشم پوشی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہ خبر ریاست کے اندر اور باہر غیر ممالک اسلامیہ تک پہنچ گئی اور عدالتِ ربّانی کا انسانیت کے سامنے اس طرح ترجمہ فرمایا کہ دُنیا قرآن مجید کے فیصلوں پر انگشت بدنداں ہو کر عش عش کر اٹھی۔ بھلا جس قوم کا عادل محکوم خدا ہو کر قرآن مجید کے فیصلے اس طرح علی الاعلان کر رہا ہو اور اپنے بچوں کو بھی پکڑ کر عدالت میں لاتا ہو اور کسی کو بھی نہ چھوڑتا ہو جس پر جیسا فیصلہ اطلاق کرے اس کے مطابق فیصلہ جاری کرتا ہو۔ اس قوم میں کون ہے جو گناہ کی جسارت کر سکے؟ کون باپ ہے اور کون بیٹا ہے؟ اس رعیّت کی کون سی ایسی ماں اور ایسی بیٹی ہوگی؟ اور کون ایسا لاڈلا ہوگا؟ جو قرآن مجید کے تاریخی فیصلوں سے بچ سکے؟

مجرمین کا کیا سوال؟ ایسی دُنیائے عدل میں جرائم کو بھی ذبح کر دیا جاتا ہے۔ جس عادل کا آئین قرآن اور حاکم خدا ہو اور اس کے رسولؐ حاکم ہوں جو اپنی بیٹی فاطمہؓ کو کسی دوسری فاطمہؓ کی سزا کے موقع پر اس طرح زجر کر رہا ہو۔ یہ تو فاطمہ بنت عبداللہ ہے اگر فاطمہؓ بنت رسولؐ ہو تو بھی اس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔ ایسی حکومتِ الٰہیہ کی سرزمینوں میں گناہ ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتا۔

حضرت علیؓ شیرِ خدا کی زرّہ چوری ہو جاتی ہے۔ پانچ سال کے بعد ایک غیر مسلم قبطی کے ہاتھوں فروخت کرتے ہوئے پکڑی جاتی ہے۔ حضرت علی شیرِ خدا کرم اللہ وجہٗ ایک مدّعی کی حیثیت سے قضاۃ خانہ اسلام میں دعویٰ دائر کرتے ہیں۔ قبطی مدّعا علیہ ہونے کی حیثیت سے عدالتِ اسلام میں حاضر ہوتا ہے۔ مدعی و مدعا علیہ اسلامی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہیں کہ اسی اثنا میں حضرت علی شیرِ خدا کرم اللہ وجہہٗ بیٹھ جاتے ہیں۔ قاضی القضاۃ کے سامنے قرآن مجید کھلا ہے۔ آواز آتی ہے "خلیفۃ المومنین آپ خلیفۃ المومنین کی حیثیت سے اپنے مدعا علیہ کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ آپ کا مدعا علیہ کھڑا ہے اس واسطے آپ بیٹھ نہیں سکتے۔ قرآن مجید مساوات کا حکم دیتا ہے۔ یہ حکمِ خداوندی سُن کر بغیر کسی رنج و ملال کے آپ کھڑے ہو گئے۔ قضاۃ خانے سے قاضیِ وقت کی دوسری آواز بلند ہوئی کہ خلیفۃ المومنین! آپ نصابِ شہادت پورا فرمائیں یعنی اپنی زرّہ کے صحیح دو گواہ پیش کریں کہ واقعی یہ زرّہ آپ کی ہے۔ باوجود جاننے کے کہ یہ میری زرّہ ہے۔ حضرت علیؓ شیرِ خدا اپنے گھر تشریف لائے اور نصابِ شہادت پورا کرنے میں کسی صنعتِ عقلی سے کام نہیں لیا بلکہ خوفِ ربّانی گواہ تلاش کرنے کے وقت بھی آپ کے سامنے موجود تھا۔

آپؓ نے اپنے اہل کاروں کو بلایا اور ان سے اپنی زرّہ کا کوئی نشان نہ بیان کرتے

ہوئے پوچھا کہ فلاں وقت میری زرّہ چوری ہوگئی تھی۔ اس کے نشانات تمہیں یاد ہیں کہ نہیں۔ اس طریقۂ استفسار سے صرف ایک گواہ ملا۔ مگر پھر بھی آپ نے اپنی زرّہ کے نشانات نہ بتائے۔ اور ایک ہی گواہ لے کر عدالتِ خداوندی میں حاضر ہوئے۔ ایک گواہ عدالت میں پیش کیا۔ فوراً فیصلہ صادر ہوا کہ خلیفۃ المومنین! قرآن مجید کے نزدیک آپ نصابِ شہادت پورا نہیں کرسکے۔ اس لیے آپ کے مقدمے کا فیصلہ قبطی کے حق میں کیا جاتا ہے۔ قبطی بری کر دیا گیا۔

آپ نے اس فیصلہ کو سُننے کے بعد اسے بخوشی قبول کر لیا اور دوبارہ اپیل کرنا حق کے نامناسب جانا۔ قبطی نے اس فیصلہ خداوندی کے بعد حقانیت خداوندی کا اسلامی فیصلوں کے ساتھ اس قدر اثر لیا کہ اسی وقت

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

پڑھ کر مُسلمان ہوگیا۔

قرآن مجید کی تاریخی عملی حیثیت مسلمانوں پر جس طرح مرتب ہوئی۔ وہ ایک طرف اپنی صداقت کا عملی اور زندہ ثبوت ہے جس نے مساوات کے میدان میں گورے و کالے، عربی و عجمی، شاہ و گدا، عوام و خواص سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا اور غرور کے اُونچے سے اُونچے سر کو خُدا کے سامنے جھکا دیا۔ اس عملی تاریخ میں قرآن کی تاریخ کائنات کی تواریخ پر برتری لے لیتی ہے۔ اور دوسری جانب مُسلمانوں کو آزادئ حق کے ساتھ علیٰ منہاج فطرت حسین ترین اعمال کے ساتھ عملی تاریخ مرتب کرنے کا موقع دیتی ہے۔ تاکہ ابنائے آدمؑ سچی تاریخ کے تعینات کو اپنا کر صداقت کی راہوں پر آجائیں۔

کربلا میں دودمانِ رسالت کا خاتمہ قرآن مجید کی تاریخی حیثیات پر ایثار و شہادت کا

مرقع بن کر سامنے آیا اور کائنات کی عزیز ترین ہستیاں سر بازار شہید ہو گئیں۔ قرآن مجید نے کربلا کے میدان میں جس تاریخ کی بنیاد ڈالی اس کا نمونہ کوئی پیش کر سکا اور نہ کبھی پیش کر سکے گا۔ اس قسم کے بہت سے واقعات صدیقوں، شہیدوں، صالحین نے قرآن مجید کے پیش کردہ احکام کی تعمیل میں اس طرح مرتب فرمائے کہ ارض و سما کی ہر چیز ان کی صداقت ماننے پر مجبور ہو گئی۔

قرآن مجید ایسی تاریخ ہے جو انسانوں کی فطرت کے عوامل پر کاربند ہونے کی تعلیم دیتی ہے کہ جس کو روح تسلیم کرنے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

قرآن مجید نے خدا کی حقانیت کے ساتھ انسانیت کو عدل و انصاف، حسن مروت مساوات اور سچائیوں کی راہ دکھائی ہے جس پر چل کر ساری دنیا نجات پا سکتی ہے۔

قرآن مجید اور عبادت

قرآن مجید کی جملہ تعلیمات انسانی طبیعت کو عبادت کے لیے رکز دیتی ہیں
تاکہ وہ خدا کے معبود ہونے کا سچا اقرار کرتے ہوئے اپنی عبودیت کا
پوری تعمیل کے ساتھ اظہار کرے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید یہ ثابت کرتا
ہے کہ قدرت کے سارے عوامل صرف انسان کے لیے ہیں اپنے مفروضوں
پر تعمیلاً کاربند ہیں اور انسان ان جملہ عوامل فطریہ کا محور کبریا ہے۔ نظامِ کائنات
کے منظوم عوامل گوشۂ عقلِ انسانیہ کو پوری ترتیب کے ساتھ مائل بہ عبادت دیکھنا چاہتے
ہیں۔ اللہ کی اس فطری ہدایت سے انسان اتنی بلندی پر فائز ہو جاتا ہے کہ وہ
صرف اللہ کا مخاطب ہو کر اس کی بندگی کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم عبادت کے لیے معبودِ برحق کا تشخص کرتا ہے اور اس کی صفات کا اس طرح تعیّن کرتا ہے کہ وہ کسی دوسرے میں نہ پائی جائیں اور اِن صفاتِ عالیہ کا استحقاق صِرف معبودِ برحق کے لیے ہو۔ اس معبودِ برحق کے لیے مختلف مقامات پر مختلف حالات کے پیشِ نظر طبعِ انسانی کے اُتار چڑھاؤ کے مطابق مختلف انداز سے ذکر فرماتا ہے اور ان حیثیاتِ ذاتیہ و صفاتیہ کے بیان کا تفصیل سے ذکر کرنا عابد کے عقیدۂ توحید کو پختہ کرنے اور حق پر ایمان کے لیے غیر مستحز کرنے کے لیے ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے معبود کے ایمان پر اور اس کے احکام کی تعمیل میں کسی کام پر لغزیدہ نہ ہونے پائے۔ چنانچہ وہ اس کی الوہیت کو اس طرح ذِکر فرماتا ہے :-

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ

یعنی اللہ وہ ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ غیب و شہود کو جاننے والا ہے اور وہ رحمان و رحیم ہے ۔

اس آیت میں الوہیت کا تعیّن، علمِ غیب اور علمِ شہود کو من حیث المجموع طور پر صفتِ علمیہ، ذاتیہ کے ساتھ اور رحمانیت، رحیمیت کی صفاتِ ذاتیہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ تینوں صفات ذاتی طور پر صرف اسی کے لیے مخصوص ہیں۔ رحمان کی صِفت ایسی ہے جس کے متعلق علمائے محققین نے فرمایا ہے کہ اس

صفت کا اللہ کے سوا کسی اور پر اطلاق نہیں ہو سکتا اور فرمایا لَا یُطْلَقُ عَلٰی غَیْرِہٖ کہ اس صفت کا اطلاق کسی دوسرے پر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

یعنی اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ حیّ و قیّوم ہے۔ نہ وہ سوتا ہے، نہ اُونگھتا ہے۔ زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے۔ اسی کے لیے ہے۔ پھر فرمایا:۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ

"یعنی برکتوں والی وُہی ذات ہے۔ جس کے قبضۂ قدرت میں سارے جہانوں کی بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت و زیست کو پیدا کیا تاکہ تمہارا امتحان کر سکے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال والا ہے۔"

اس قسم کی بہت سی آیاتِ قرآن مجید میں الوہیّت کا تعیّن اسمِ اللہ اور اس کی صفات کے ساتھ تیار کرتی ہیں۔ خدا کی کرشمہ سازیوں کو محض اس واسطے تکرار سے بیان کیا جاتا ہے کہ ذہن انسانی پر اللہ کی ذات معہ اپنی صفات کے مثبتِ حقیقی کی صورت میں ثبت ہو جائے۔ اس تصوّر کے ذہن نشین کرنے کا منشاء پُورے جذباتِ باطن کے ساتھ ایمان لا کر اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ عبادت کے لغوی معنی "بندگی" کے آتے ہیں۔ بندگی اس چاکری کا نام ہے۔ جو اپنے مالک کی مرہُونِ منّت ہو کر اس کے احکام کی بجا آوری میں اپنے اعمال کا صدقِ دل سے مظاہرہ کرے:۔ جن کی ادائیگی کے ساتھ اس کے مالک کی رضا ہو۔ اور مرضیاتِ مالک کے چھوٹے چھوٹے احکام

سے لے کر سخت سے سخت ترین احکام کی پابندی کرنے سے گریز نہ کرے۔ جزواً اور کلاً مالک کے احکام کی پابندی کا نام بندگی ہے۔ اس کے تعیّنات سے سرِمُو فرق لانا بندگی کے منافی ہے۔ عبادت بظاہر ایک چھوٹا سا لفظ ہے جو پانچ حُروف پر ترتیب دیا گیا ہے۔ مگر معانی اور تاثرات کے اعتبار سے اتنا جامع ہے کہ دُنیا کی ہر چیز اس کی ادائیگیِ حق کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے۔ قانُونِ فطرت میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کی نوعیت کے مطابق کچھ کام سپرد کیا ہے۔ اس تقسیمِ عمل میں "ذوی العقُول" اور "غیر ذوی العقول" ذی جان اور غیر ذی جان ساری مخلوق شریک ہے۔

خدا کی ہر مخلوق اپنے مقسُومہ اعمال کی انجام دہی میں اپنی آفرینش سے لے کر آج تک مصرُوفِ عمل ہے۔ بہائم اور وحُوش ذی جان مخلوق میں چیونٹی سے لے کر سیمرغ تک اور جملہ بہائم اور وحُوش و طیور تک، بحری اور برّی ذی جانوں تک، ذرّے سے لے کر آفتاب و مہتاب تک کوئی ایسی چیز نہیں جو اپنے مفروضہ سے ایک لمحے کے لیے بھی غفلت کر رہی ہو۔ ذرّوں سے چھوٹی دُنیا منفیہ ہے۔ منفیوں کا مفروضہ عند الحکمت یہ ہے کہ وہ ذرّے کے گرد ہمہ وقت مصرُوفِ گردش ہوتے ہیں۔ اور ان کی یہ گردش تعمیل حکم باری تعالیٰ سے واقع ہوتی ہے۔ بعض عارفوں کے نزدیک بارہ منفیے ایک ذرّے کے گرد گردش کرتے ہیں۔ مگر سائنس کی دقیق حکمت نے ان کو متعدّد کہا ہے۔ بہر حال ایک ذرّے کے گرد متعدّد منفیوں کا گردش کرنا منفیوں کا فریضہ ثابت کرتا ہے۔ جب دو ذرّے قریب ہوتے ہیں تو ان کی دوئی کے ساتھ منفیوں کی تعداد بھی ثانیوں میں بدل جاتی ہے۔

اس طرح دس ذرّوں کے ساتھ ہزار منفیوں کی گردش ایک عظیم تحرّک بپا کر دینے

کا باعث ہو جاتی ہے۔ یہ ذرّات و منفیوں کا باہمی ارتباط دُنیا کی تعمیر میں ایک عجیب کردار ادا کرتا ہے۔ جب یہ کروڑوں ذرّے ایک ٹیلے کی صُورت اختیار کر لیتے ہیں تو اس تحریک کے ثانیوں میں تبدیلی کا حیرت انگیز مطالعہ اہلِ فکر ہی کر سکتے ہیں۔ اسی ارتباط پر کائنات تعمیر ہوئی۔ یہ سارے غیر ذی جان عوامل اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنے عمل کو جاری رکھتے ہیں۔

ایک ذرّے و منفیے کی تعمیل حکمِ الٰہی سے وُہ معجز نمائیاں رُونما ہوتی ہیں جن کی تشریح کے لیے ابدالآباد تک کے لیے وقت ناکافی ہو جاتا ہے۔ ایک چھوٹے سے پودے کی دُنیا میں، پانی کی نقل و حمل ان ہی ذرّوں اور منفیوں کی تحریک کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بظاہر ایک سو فٹ کا درخت جو سخت جان نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ایسی مشین منسلک نہیں ہے جو ساٹھ فٹ کی بلندی پر اس کی کونپلوں اور اس کے پھل پھول میں پانی تقسیم کر سکے۔ مگر اس کی لہلہاتی ہوئی دُنیا کسی خاموش لشکر کی اپنے مفروضوں پر چلنے کا مرہُونِ منّت ہوتی ہے۔

یہ ذرّوں کے تعمیلِ حکم کا نتیجہ ہوتا ہے کہ نباتات تدریج سے حالتِ بلوغ حاصل کر کے ذی جان مخلوقات کو اپنے پھل پھول سے نوازتے ہیں۔ اسی تعمیلِ حکم کے نتیجہ میں ذی جان مخلوقات اپنا رزق مہیا کرتی ہے۔ کائنات کی وُسعتیں اپنے دامن میں جتنی لاتعداد مخلوقات سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ سب اسی تعمیلِ حکم کا نتیجہ ہیں۔ ان پر غور و خوض کرنے کے لیے اس واسطے بار بار انسان کو تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ قدرت کے ان عوامل پر سنجیدگی سے غور و فکر کر سکے۔ جن سے انسانی فکر کو تحیّر پیدا ہو اور خُدا اور اس کی قدرت کے سامنے مبہوت ہو کر اپنی عاجزی کا اعتراف کر لے۔

قرآن مجید کی جملہ تعلیمات انسانی طبیعت کو عبادت کے لیے رکز دیتی ہیں۔ تاکہ وہ خدا کے معبود ہونے کا سچا اقرار کرتے ہوئے اپنی عبودیت کا پوری تعمیل کے ساتھ اظہار کرے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید یہ ثابت کرتا ہے کہ قدرت کے سارے عوامل صرف انسان کے لیے ہیں، اپنے مفروضوں پر تعمیلاً کاربند ہیں اور انسان ان جملہ عوامِل فطریہ کا محورِ رہا ہے۔ نظامِ کائنات کے منظوم عوامِل گوشۂ عقلِ انسانیہ کو پوری ترتیب کے ساتھ مائل بہ عبادت دیکھنا چاہتے ہیں۔ اللہ کی اِس فطری ہدایت سے انسان اتنی بلندی پر فائز ہوجاتا ہے کہ وہ صِرف اللہ کا مخاطب ہو کر اس کی بندگی کرتا ہے۔ عبادت کا بنیادی مفہوم منفی سے مثبت کی طرف رجعت ہے۔ منفی اور مثبت کا تعلق ہر میدان میں اضافِ کائنات کو اجسام کی صورت میں اور حیات کی صورت میں زندگانی دیتا ہے۔

مادّی کائنات میں ہر مثبت شے کے ساتھ منفی کا ہونا مقصدِ تحریک کے نتیجہ خیز ظہور کے لیے ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح معبودِ حقیقی کے لیے ماسوا اللہ کے موجودات کو منفی کر دینے سے ثبوتِ حق کا دِل پر ظہور ہوتا ہے۔ اور اس کا اقرار بزبانِ مومن: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے تعلیمی اقرار کے ساتھ ہوتا ہے جو بظاہر اقرار اور بباطن تصدیق قلب سے رُونما ہو کر مکمل اقرار بنتا ہے۔ جس سے عبادت کے لیے جذبۂ محبت پیدا ہوتا ہے۔

محبت ایک ایسا جہاں ہے۔ جس کی تمنائیں محبوب کے لیے منزلیں اختیار کرتی ہیں اور منازل کے جملہ رازہائے سربستہ کو معلوم کر کے حاصل کرنا محبت ہی کا حصہ ہے۔ محبت راز کے میدانوں کو تلاش کرتی ہے اور محبوب کا نیاز حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس

ترتیب کے ساتھ عبادت سے پہلے محبّتِ خداوندی کا میسر آنا عبادت کے لیے لازم ہے اس راہ میں محبّت، راز و نیاز تینوں کی سالکِ راہ کو ضرورت درپیش آتی ہے۔ اور یہی تینوں چیزیں سختی منزل کو سالک پر آسان کرتی ہیں اور سختی منزل کو سالک اپنا زادِ راہ بناتا ہے اور جو سالک تلاشِ حق کے لیے ان چیزوں کو زادِ راہ بناتا ہے۔ اس کو قناعت اور ریاضت جیسی کٹھن منزلوں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ جس کو عشاقِ حقیقت کے گرد آلود چہروں نے اپنی مشقت سے ثابت کیا ہے۔

ہر منفی اپنے مثبت کے سامنے محکوم ہوتا ہے۔ اور ہر مثبت اپنی صفاتِ غالبہ کے ساتھ منفیوں پر شہانہ طور پر حاکم ہوتا ہے اور ان دونوں کی حیثیت اپنے اپنے مقام پر طالب و مطلوب کی ہوتی ہے۔ مطلوب کا ثبات ہی طالب کو وجدانی تحریک سے گردش دیتا ہے۔ اور یہی گردش مقصودی حیثیت میں معراجِ کمال کی طرف بڑھتی ہے۔

غیر ذی جان چیزیں اپنے مثبت و منفی میدانوں سے گزرتی ہوئی اِنسانی عقل کو دعوتِ حق دیتی ہیں کہ ہم صرف تیری خدمت کے لیے مامور ہیں، مگر دعوتِ حق انسانی عقل کو اپنی طرف دعوت دیتی ہے کیونکہ عبادتِ الٰہی کا اختصاص بندے کو سونپا گیا ہے اور یہ بندے قرآن مجید کی زبان میں جنّ اور انسان ہیں۔ جن کو عبادات کے تکلفات میں ڈالا گیا اور عبادات کی تخصیص ان کے ساتھ فرمائی۔ ارشاد فرمایا:۔

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْن ؕ

"ہم نے جنّوں اور انسانوں کو سوائے عبادات کے اور کسی غرض کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔"

اس میں صرف دو گروہوں کو اس واسطے مخصوص فرمایا گیا کہ وہ صاحبِ عقل

ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ نفس بھی ہیں۔ تکلّفات کا لزوم نفسیات وخواہشات اور لذات کی موجودگی میں ہوتا ہے ورنہ وہ محض فعل خلقی ہو جاتا ہے۔ فعلِ خلقی اس مشین کی مانند ہے کہ جس کو جس کام کے لیے بنایا جائے۔ بس وہی کچھ کرتی ہے۔ تکلّف کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مگر اس کے مقابلے میں فعلِ امری ایک ایسا سلسلۂ عمل ہوتا ہے جس میں تکلّف لازم ہوتا ہے۔ اس آیت میں فرشتوں کو اور دوسری مخلوقات کو شامل نہیں کیا گیا کہ یہ فعل خلقی کی حیثیت میں ہیں۔

فرشتے اگرچہ ذوی العقول ہیں مگر نفسیات سے مبرّا ہونے کی وجہ سے غیر مکلّف ہیں۔ ان کو جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ ان سے بہرحال سرزد ہوتا رہتا ہے۔ اور اس حالت میں انہیں اضداد اور اعلال سے مجاہدہ درپیش نہیں آتا لہٰذا حکمِ الٰہی کی تعمیل میں انہیں کوئی تکلّف محسوس نہیں ہوتا۔ نہ ان کے سامنے گردشِ روزگار ہے نہ بھوک ہے نہ ننگ۔ نہ سفر و حضر کی صعوبتیں، نہ رنج و الم، نہ اولاد نہ خاندان نہ طلب معاش اور نہ حوادث، نہ فکرِ زوال، نہ ہنگامۂ کائنات کی فکر۔ یہ تمام اضداد اور اعلال صرف جنّوں اور انسانوں کے لیے ہیں۔

فرشتوں کے علاوہ تمام حیوانات جو مطلق حیوان ہیں وہ غیر ناطق اور غیر عاقل ہونے کی بناء پر غیر مکلّف قرار دیے گئے۔ اس واسطے احکام کی تعمیل کی صعوبتوں کا احساس نہیں کرسکتے۔ لہٰذا ان کو اور غیر ذی جان چیزوں کو فعلِ خلقی پر تعبیر کرکے غیر مکلف قرار دیا اور جملہ صعوبتوں کو تعمیلِ حق کی بجا آوری کے لیے جھیلنا انسانوں اور جنّوں کے لیے مخصوص کیا۔ تخلیقِ آدم بندگی کے لیے ہوئی اور بندگی کی تکمیل صعوبتوں کو عبور کرنے کے ساتھ رکھی گئی۔ اسی واسطے فرشتوں کی تخلیق کے بعد بنی آدم کی تخلیق فرمائی گئی۔ بنی آدم سے پہلے

جنّات کو تخلیق فرمایا گیا۔ مگر یہ مغلوب الغضب ہونے کی بنا پر مفضول کر دیے گئے اور پیکرِ خاکی کو صورتِ آدمؑ میں مجموعۂ شفقت بنا کر فرشتوں، جنّوں اور سب مخلوقات پر افضل قرار دے دیا اور تکمیلِ بندگی کا فریضہ اس کے سپرد کیا۔ اس تخلیق کا اعادہ بالارادت اس فرمان کے ساتھ کیا اور فرمایا:۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ

یعنی جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں تو فرشتوں نے اس خطابِ ربانی پر جواباً کہا کہ اے اللہ! تو اس کو خلیفۂ ارض بنانا چاہتا ہے جو زمین پر فساد کرے گا اور خون ریزی کرے گا۔ حالانکہ اس کے مقابلے میں ہم بلا جدل و قتال تیری تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں۔

فرشتوں نے یہ بات الہاماً کہی تھی۔ ورنہ بعد میں آنے والی نسلِ آدمؑ کے متعلق انہیں قبل از تخلیق کیا خبر ہو سکتی تھی۔ اس کے جواب میں پروردگارِ عالم نے فرمایا:۔

قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ "اے فرشتو، تمہاری تخلیق اور تخلیقِ آدمؑ کے بارے میں میں زیادہ علم رکھتا ہوں جو تم نہیں رکھتے"۔ چونکہ فرشتوں نے اپنا سوال استطاعتِ علم تسبیح و تقدیس پر کیا تھا۔ اس واسطے ان کی استطاعتِ علمی پر غالب فضیلتِ علمیّہ کے ثبوت کے لیے جو بندگی میں اعلیٰ مقام رکھتا ہو۔ تخلیقِ آدم کے ساتھ آدم کو تفویض کر دیا اور فرمایا:۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ۔

یعنی آدم علیہ السلام کو جملہ علوم سکھائے گئے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ کوئی گوشۂ علم ان

پر مخفی نہ رکھا گیا۔ اس تفویضِ علمیہ کے بعد قدرتی طور پر ایسے سوال کے ایسے جواب کے بعد قطعی فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ عادلِ حقیقی بندگی کے میدانوں میں فیصلہ بکمال کرنا چاہتے تھے تاکہ عدلِ خداوندی کا کوئی گوشہ سائلوں پر چھپا نہ رہے اور وہ میدانِ بندگی میں خدا کے انتخاب کو پورے فیصلوں کے بعد تسلیم کرلیں اور یہ تسلیم و رضا ہمیشہ کے لیے انسانوں کو میدانِ زندگی میں فضیلت دے۔ چنانچہ سائل فرشتوں اور آدم علیہ السلام کو بعد از تخلیق متعارض کیا۔ اس تعارض میں فیصلۂ خداوندی آدمؑ کے حق میں ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:-

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

یعنی پھر فرشتوں اور آدم علیہ السلام کو امتحانی طور پر ایک دوسرے کے سامنے کر دیا۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کے مقابلہ میں جملہ اسماءِ مسمیات بیان کرو۔ اس امتحانی سوال پر فرشتے علمِ آدم کے سامنے فیصلۂ ربانی پر مبہوت ہوکر ورطۂ حیرت میں رہ گئے اور سخت تعجب کی حالت میں بول اُٹھے۔

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○

"یعنی پاک ہے تو۔ تمام تسبیحات تیرے لائق ہیں۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ مگر صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے خلقی طور پر ہمیں تفویض فرمایا۔ چونکہ تو ہی جاننے والا حکیم ہے۔ تیرے علم و حکمت کے سامنے تیرے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔"

یہاں نوعیتِ تخلیق کا تعارض خاکی اور نوری کے ساتھ ہوا۔ خاکی صاحبِ نفس فضیلتِ علمیہ کے ساتھ آراستہ ہو کر ان نوریوں کے سامنے آیا جو اس ابزارِ نفسانیہ سے محروم تھے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ فضیلتِ علمیہ اور فضیلتِ عملیہ کے میدانوں میں حصولِ بندگی کے لیے انسان کو صفِ اوّل اس واسطے دی گئی کہ اس کی خلقت تعمیلِ حکم کے لیے مکلّف

تھی۔ اس کے بعد کی آیات میں پروردگارِ عالم نے مکلّف آدمؑ کو مسجودِ ملائک ہونے کا موقع بخشا اور فرشتوں کو فرمایا کہ تم آدمؑ کے سامنے سجدۂ تعظیم بجا لاؤ۔ تمام فرشتوں نے اس حکم کی بلا کسی لیت و لعل کے بجا آوری کی۔ مگر شیطان نے اس مقام پر مغلوب الغضب، اور مغلوب الحسد ہونے کی بناء پر نافرمانی کی۔ تکبّر کیا اور بجا آوریٔ حکم الہٰی سے رُوگردانی کرتے ہوئے کافر ہوا۔

عارفوں نے فرمایا کہ پروردگارِ عالم نے جہاں آدمؑ کو نفسانی اضداد کے مقابل پیدا کر کے بندگی کے لیے ادائیگی کا حکم دیا۔ وہاں شیطان کو اس کے نفس کے مقابل اعلال کی صورت میں پیدا فرمایا۔ یہ تکلّف در تکلّف کی صُورت پیدا ہو گئی۔ پہلے آدمؑ تخلیقی طور پر صرف ایک ضدِّ نفسانی کے ساتھ پیدا ہوا۔ تخلیقِ شیطانی کے بعد اسے مزید اعلال کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السّلام کو جنّت الفردوس میں رکھا اور دونوں میاں بیوی کو جنّت الفردوس میں رہنے کا حکم صادر فرمایا —

اِنِّیۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ کی عملی تفسیر کا آغاز جنّت الفردوس میں دانۂ گندم کے ساتھ شروع کیا۔

چونکہ نفس کی فطری عادت اشتہا پسندی ہے اور اشتہائے نفسانی کو رفع کرنے لیے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ دانۂ گندم، اشتہائے خُوراک کے مقابل تھا۔ اسی واسطے اسی کو دونوں میاں بیوی کے امتحان کے لیے تجویز فرمایا گیا۔ ارشاد ہوا :-

یٰۤاٰدَمُ اسۡکُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُکَ الۡجَنَّۃَ وَکُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ؕ

اے آدمؑ، تو اور تیری بیوی دونوں جنّت الفردوس میں آرام کرو اور اس

باغِ جنت سے جہاں جہاں سے چاہو اپنی حسبِ خواہش پھل کھاؤ، مگر اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ ظالموں سے ہو جاؤ گے۔

ان آیات میں آدم و حوّا علیہما السّلام دونوں کو صرف نفسِ جسمانیہ کے ساتھ جنّت کے پھل پھول حسبِ خواہش کھانے کی اجازت مل گئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ رغبت کے ساتھ کھانا پینا معاصی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ بلکہ امرِ مانع کی خلاف ورزی باعثِ عصیاں ہوتی ہے۔ اہلِ اللہ کا نفس تابع دِل ہوتا ہے اور ان کا دِل تابع فرمانِ خداوند تعالیٰ ہوتا ہے۔ اور وہ فرمانِ ذوالجلال کے خلاف نہیں ہو سکتے۔ اور نہ نفس کے ہاتھوں لغزش کھا سکتے ہیں۔ بالخصوص انبیاء علیہم السّلام معصوم عن الخطا ہوتے ہیں اور یہی معصومیت ان کی بندگی کی اعلیٰ علامت ہوتی ہے مگر اس مقام پر آدمؑ و حوّا دونوں کو نفس نے لغزش نہیں دی بلکہ شیطان نے لغزش دی یہ لغزش ان کی ذاتی لغزش نہیں تھی بلکہ شیطان کے ساتھ خارجی لغزش ہوئی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ

(یعنی ان دونوں کو شیطان نے لغزش دی۔ اس بناء پر ان دونوں کو تو اس جنت سے نکال دیا گیا جس میں وہ رہتے تھے۔)

اس تشکیل اضدادی اعلائی، یعنی نفسانی اور شیطانی کے ساتھ ساتھ آدم علیہ السّلام کو اس جنّت سے جہاں قطعی آسودگی تھی۔ ایک ایسی دنیا کی طرف ہبوط دیا جہاں زندگانی گزارنے کے لیے محنتِ شاقہ کے سوا کوئی دوسری راہ موجود نہیں تھی۔

ایک طرف آدم علیہ السّلام اور ان کی بیوی دونوں اللہ کی ذات سے آشنا تھے اور یہ جانتے تھے کہ انہیں فضیلتِ علمیّہ، انسانیہ اور اعمالِ نفسانیہ کے ساتھ اللہ نے نواز رکھا ہے۔ دوسری طرف دانۂ گندم کھانے سے انہیں نافرمانی کی خفت اور ندامت

اٹھانی پڑی۔ تیسری طرف اپنے دشمن شیطان کی دشمنی سے بھی مطلع ہو چکے تھے کہ اسی دشمن کی دی ہوئی لغزش سے ہمارے لیے مزید الجھنیں پیدا ہوئیں۔ چوتھی طرف دنیا کی محنت شاقہ کا سامنا تھا۔ ان مختلف النوع تحریکوں کی موجودگی میں غلبہ عشقِ الٰہی اور اس کی رضا کا حاصل کرنا وغیرہ مشکلات کے اتنے باب تھے جو آپ پر کھول دیے گئے۔ جن کو اضداد در اضداد، اعلال در اعلال کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

فرشتوں کی بندگی کے مقابل انسان کو اتنی بڑی مشکلات کا سامنا بندگی کی بنائے اوّل ہے۔ معلوم ہوا کہ نفس اور شیطان کی تخلیق صرف انسانوں اور جنوں کے لیے ہوئی۔ اور یہ دونوں ہی تکلّفِ نفس کے میدان میں اوّل و ثانی کی حیثیت رکھتے ہیں اور فرشتگانِ مقربین کو ایسے اضداد کا نہ کبھی سامنا ہوا ہے، نہ ہوگا۔ دوسری وجہ بندگی کی راحتوں کو حاصل کرنے کی یہ ہے جب تک حالتِ تضدین نہ پیدا ہو۔ تمیز حق و باطل نہیں ہو سکتی۔ نہ خوشی و غم کی تمیز ہی ہو سکتی ہے اور نہ جزا و سزا کا خیال پیدا ہو سکتا ہے ایسے حالات میں امتحان کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا اور امتحان کی عدم موجودگی میں جزا اور سزا لا حاصل ہو جاتے ہیں۔ فرشتوں کو نہ کسی وسوسہ کا اندیشہ ہے اور نہ بھوک و ننگ کا احساس ہے نہ انجام کار خوشی کا تعین کر سکتے ہیں۔ ان کو جس حالت میں پیدا کیا گیا وہ ذکرِ الٰہی ہے اور یہی ان کی غذا ہے۔ ذکر و فکر ان کے نورانی جسم کے ساتھ جان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی ان کی متاعِ زیست ہے۔ انجام کی خوشی وہی پا سکتا ہے جس نے مقصودِ مطلق کی تلاش میں گوناگوں مصائب اور آلام زندگی کو برداشت کیا ہو۔ جس نے راہ محبوب میں اپنا چہرہ گرد آلود کیا ہو اور طلب کی راہ میں دریدہ جاں ہوا ہو۔ عشرتِ منزل کو اپنے محبوب کے لیے بار بار ترک کیا ہو اور متاعِ زیست

کو قربان کیا ہو- یہ قربانیاں غایت درجہ پر اولادِ آدمؑ کے حصّہ میں آئیں-

اس مقصدِ بندگی کو تکمیل دینے کے لیے ایّامِ دُنیا اور حادثاتِ دُنیا کے ہاتھوں میں آدمؑ کو دے دیا- جہاں بجلیاں کوندتی ہیں- زلزلے آتے ہیں- آئے دِن آلام اور آشوب کا ظہُور ہوتا ہے اور ہر گام پر نئے طُوفان اور نئی آندھیوں کے لیے اور نئے انقلاب آفریں حالات سے دو چار ہونے کے لیے ہمہ تن تیار رہنا پڑتا ہے- ان سب حادثات کی موجودگی میں عشق کی چنگاری کو محبّت کی پھُونکوں سے اور عملِ پیہم سے شعلوں میں تبدیل کرنا اور اپنی زندگی کو عشق کی آتش فشاں بھٹی بنانا طالبانِ حق کا مشغلہ ہے- بندگی کا تعیّن آسودگی پر نہیں ہوتا- اس کی تشکیل حوادث پر ہوتی ہے-

جنّوں اور انسانوں کی تخلیق صِرف عبادت کے لیے عمل میں لائی گئی- اس عبادت کا پہلا ظہُور دِل پر ہوتا ہے جو عقل و نفس کے درمیان معلّق ہے- دِل پر معبُود کا تعیّن کر کے اس کی عبادت کرنا پُلِ صراط پر سے گزرنے کی مانند ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز تر ہے- کیونکہ عقل و نفس جیسے خوفناک عفریتوں کے درمیان عبادت کا گزارنا اور شیطان جیسے چالاک دشمن کی موجودگی میں عقل و دِل کی اختراعات سے بچنا دشوار ترین مراحل سے ہے- اگر عقل نفس کا رفیق ہو جائے تو اس کی بے ہنگام تنقیدات کی یورش بر سبیلِ نفس و شیطان صراطِ مستقیم سے جو عبادت کی راہ ہے ہٹا دیتی ہے-

جب عقل اوہامِ نفسانی کا شکار ہو جائے تو حق کے راستوں میں باطل کی حمایت میں تنقید کرتا ہے- اکثر انسانوں میں نفسانی عقل نے ہی برگشتگی پیدا کی- اور یہی برگشتگی زمرۃ الانسان میں فرعون و نمرُود و ہامان اور شدّاد جیسی صورتوں میں نمودار ہو کر راہِ حق میں ضِد بن کر امنِ عالم کی تباہی کا باعث بنتی رہی اور بندگی کی راہوں کو بار بار پامال کرتی

رہی جس کے نتیجہ میں بار بار انبیاء جیسے عبّاد و زہّاد کو آسمانی صحائف کے ساتھ نفس و شیطان اور باغی عقول کا مقابلہ کرنے کے لیے مبعوث کیا جاتا رہا۔ اس تبعیث کا تکرار بار بار انسانوں کو عبادت کی راہ پر چلانے کے لیے کیا جاتا رہا۔ تاکہ وہ عبادت کا صحیح مفہوم اخذ کرنے کے بعد تجویزاتِ الٰہیہ کے مطابق عباداتِ الٰہیہ کے فطری فریضہ کو از سرِ نو حاصل کر کے تلافیٔ مافات کریں۔ تلافیٔ مافات کی وہی صورت ہے جس کو آدم علیہ السّلام نے اللہ کی پہچان کے ساتھ اعترافِ ذاتی کے ساتھ انجام دیا۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ؁

(اے ہمارے ربّ! ہم نے اپنی جانوں پر ناانصافی کی۔ اگر تو ہم کو نہ بخشے اور نہ رحم کرے تو یقیناً ہم خسارے میں ہیں۔

ایک معصوم عن الخطا نبی اللہ کسی خارجی لغزش کی بنا پر اعترافِ عصیان کر سکتا ہے تو ظاہر ہوا کہ یہ اعتراف بندگی کا جزوِ اعظم ہونے کی حیثیت سے ایک حصۂ عظیم بن جاتا ہے۔ بندگی کے ساتھ ساتھ احساسِ گناہ، انجام کا خوف اور اس کا اعتراف اللہ کے زیادہ قریب کرنے کا باعث ہے۔ راہِ سلوک میں اس اعتراف کو اور اس خفّت و ندامت کو اور اس قلق و اضطراب کو توفیقِ عبّاد کہا گیا ہے۔ یہ توفیقات بندگی سے ایک توفیق ہے۔

اپنے خدائے رحمان و رحیم اور جبّار و قہّار کے سامنے اعترافِ گناہ کرنا شانِ بندگی میں داخل ہے۔ انانیت کے باعث اعراض عن الاعتراف جرمِ بندگی قرار دیا گیا ہے۔ اس واسطے ترتیبِ اعمال کا آغاز نفس کے طوفانوں سے دوچار ہو کر اس کے تلاطم کے تھپیڑے کھانے کے بعد اعتراف کے ساتھ ہوتا ہے۔ الوہیت کا تعیّن اسی کے

احکام کی فرماں برداری اور تجویزاتِ عبادت پر مرتب ہو کر بندگانِ خدا کے لیے نصابِ بندگی بنتا ہے۔

اس نصابِ بندگی میں قرآن مجید عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت، عقیدۂ کتاب و سُنّت، عقیدۂ برزخ، عقیدۂ حشر و نشر، عقیدۂ جزا و سزا سب کو شامل کرتا ہے اور اپنے معتقدین کے لیے ایمان بالغیب کے ساتھ عبادات کا تعیّن، اقامت الصلوٰۃ، انفاقِ مال، ایمان بالکتب اور عقیدۂ آخرت پر مرتّب کرتا ہے۔ جس کی تفصیل ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب، ایمان بالرسل، عقیدۂ تقدیر خیر و شر اور عقیدۂ بعث بعد الموت اور ایمان بالصفات باری تعالیٰ اور ایمان باسمائے باری تعالیٰ اجمالاً اور تفصیلاً کی حیثیت میں اقرار لسانی اور تصدیق قلبی پر مرتب فرماتا ہے۔ اس کے بعد کلمۂ توحید اور کلمۂ شہادت ہمیشہ کے لیے بنائے عقائد بن کر مومن کے لیے تکمیلِ ایمان کا باعث بنتا ہے۔

اس مرحلے سے گزار کر اہلِ ایمان کو طہارتِ بدنیہ کے ساتھ جس کو غسل و وضو قرار دیا گیا عبادات کے فرائض انجام دینے کی تلقین کرتا ہے۔ اس ایمان سے نجاست کفریہ معدوم ہو جاتی ہے۔ جس کا منشاء مومن کو نفاقِ نفسانی و شیطانی سے بچا کر راہِ راست پر عبادت کرنے کی تاکید ہے۔ اس کے بعد عبادت کے متعلق اس کو نوعیتِ معیّنہ پر بندوں کو بندگی کا حکم صادر ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں بار بار اَقِیْمُوا الصَّلوٰۃَ یعنی نماز قائم کرو کا حکم دیا جاتا ہے۔ صلوٰۃ سے مراد اعمالِ نبویّہ ہے اور ان کے پیروکار صحابہ رضؓ کے اعمال سے پنجگانہ نماز ثابت ہوتی ہے۔ جس کا قرآن مجید میں تفصیلاً ذکر آیا ہے۔ فجر

کی نماز، ظہر کی نماز، عصر، مغرب اور عشاء کی نماز تصریحات کے ساتھ ملتی ہیں۔ نیز عبادات کی سنّت و نوافل کی صورت میں بھی تلقین فرمائی گئی ہے۔

بندگی کے ہر میدان میں فرض، سنّت اور نوافل کی تعلیم ملتی ہے۔ اس مقام پر تشریحِ عبادت کے لیے اس مفہوم کا ہونا بہت ضروری ہے کہ عبادت سنّتِ خداوند تعالےٰ نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ یہ علامت بندوں کے لیے ہے۔ ادائیگی عبادت کا تعلق سب سے اوّل نبیوںؐ کے ساتھ ہے۔ نبیوںؑ کی ادائیگی کے ساتھ وہ عبادت سنّت بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ادائیگی عبادت سے منزّہ ہے۔ بندگی فعلِ خداوندی نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے اس پر سنّتِ اللہ کا بھی اطلاق نہیں ہو سکتا۔ عبادت فرض ہو یا سنّت نفل ہو یا مستحب، ہر صورت میں سُنّتِ نبیؐ اللہ ہے۔ صرف اس پر حکم خداوندی کا اطلاق ہوتا ہے۔

حکم خداوندی کے بعد عبادات و معاملات جملۃً سنّتِ نبی کی صورت میں فرض و سنّت اور نفل بنتے ہیں۔ لہذا اس سنّت پر ایمان رکھنا شرک سے نجات دیتے ہوئے عبادت کا جزوِ اوّلی ہو کر بندے کو عبادت کے مبادیات دیتا ہے۔ قرآن مجید نے اس عبادت پر اس واسطے زور دیا تاکہ بندہ عبادت کے ساتھ محض اللہ کا ہو جائے اور اس کا ہو جانے کے بعد بندگی کے وہ فرائض بھی انجام دے جو معاملات کی صورت میں اس پر عائد کیے گئے ہیں۔ اس صورت میں عبادات کو لازم کی حیثیت دی گئی ہے اور معاملات کو ملزوم کی۔

جو معاملات بندگی سے الگ ہوں۔ ان میں انانیّتِ نفسانیّہ آجاتی ہے اور غرورِ نفس غالب آکر اس کو نفس کی بندگی کے لیے مجبور کرتا ہے۔ یہی مجبوری نافرمانی

خدائے تعالیٰ کا باعث بنتی ہے اور جملہ معاصی انہی معاملات سے پیدا ہوتے ہیں اور بندوں کی اخلاقی صورت کو بگاڑ کر مسموم کر دیتے ہیں اور یہ سمیّت بداخلاقی کی صورت میں فرد سے افراد کو اپنی لپیٹ میں لے کر بندگی کی سعادتوں سے محروم کر دینے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ تمام بداخلاقیوں کا وجود اللہ کی عبادت سے الگ ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ۔ جس نے عبادت سے تزکیۂ نفس کیا۔ وہ فلاح کو پہنچا۔ یہی تزکیۂ نفس ختمی طور پر سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو عطا ہوا جس پر آپ نے خلقِ عظیم پایا اور فرمایا گیا:

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۔ یعنی آپؐ صاحبِ خلقِ عظیم ہیں۔ اخلاق کا دارومدار اعمالِ صالح پر ہوتا ہے ۔ اس بنا پر حضور علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم کے ایامِ طفولیت سے لے کر بعثت تک جن اعمال کا صدور ہوا اور بعثتِ نبوت سے دمِ آخر تک پر آپؐ پر جو احوال، اقوال، اعمال مرتّب ہوئے۔ وہ سب کے سب آپؐ کی عبادات و معاملات پر محمول ہوئے اور یہ سب معمولات مجوزات باری تعالیٰ تھے جن کو ختمی بندگی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے ان اشارات اور احکام کے ساتھ رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہی تقویٰ کی صحیح بنیاد ہو سکتا ہے۔ اور ان ہی پر بالعبادات تقویٰ کو مقامِ کمال مل سکتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:۔

مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا

جو کچھ تمہیں اللہ کے رسول دیں۔ اس پر عمل کرو، اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز آجاؤ۔ یعنی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنّتِ پاک سے جو کچھ تمہیں ملے اس پر عمل پیرا ہو کر

بندگی کا ثبوت دو۔ اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز آکر تعمیل حکم کا بندگی کے ساتھ ثبوت مہیا کرو۔ خلافِ پیغمبرؐ ہر قسم کی بندگی نامقبول ہے۔ ان عبادات کی پانچ بنائیں رکھی گئی ہیں :۔ اللہ اور اس کے رسُولِ مقبولؐ پر ایمان لانا۔ نماز کا قائم کرنا زکوٰۃ کا ادا کرنا۔ رمضان المبارک کے ماہِ طیّبہ کے روزے رکھنا۔ بشرطِ استطاعت حج کرنا۔ ان باتوں میں سے کسی ایک کا بھی عمداً انکار کرنا کفر کے مترادف ہے۔ ان سب میں سے زیادہ تاکید پنجگانہ نماز کی فرمائی گئی ہے۔ یہاں تک ارشادِ باری ہے :

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ط

نماز قائم کرو اور مشرک نہ بنو ۔ قیامت کے دِن جنّت کے کناروں پر کھڑے ہو کر اہلِ جنّت جہنمیوں سے سوال کریں گے ۔ مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ۔ کون سی چیز تم کو جہنّم میں لے گئی تو جہنمی اس کے جواب میں کہیں گے ۔ قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ یعنی نماز نہ پڑھنے کی بدولت ہم کو جہنّم کا ایندھن بنایا گیا۔ حدیث شریف میں قرآن مجید کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا گیا :

اَوَّلُ مَا یُحَاسَبُ بِہِ الْعَبْدُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ھِیَ الصَّلٰوۃ

یعنی قیامت کے دِن جس چیز کا سب سے پہلے حساب ہو گا وہ نماز ہے۔ پھر حدیث شریف میں آیا ہے :

اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ فَمَنْ اَقَامَھَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّیْنَ وَمَنْ ھَدَمَھَا فَقَدْ ھَدَمَ الدِّیْنَ

یعنی نماز دین کا ستون ہے جس نے اس کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا جس نے اس کو گرا دیا اس نے دِین کو گرا دیا۔

اس حدیث سے ترک الصّلوٰۃ کی وعید کا اندازہ لگ سکتا ہے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔

گویا ایوانِ اسلام کی بنیادوں کو ہلا دینے والا جرم ہے اور اس کے قیام کے ساتھ کتنی بڑی بشارت ہے کہ قیامِ صلوٰۃ کے ساتھ ایوانِ اسلام کو تقویت ملتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں حصولِ اخلاقیات کے لیے اور اجتنابِ معاصی کے لیے نماز کو اس طرح سبب بیان فرمایا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ۔

یعنی نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے اور ذکرِ الٰہی اس پر افضل ہے۔ یہاں ذکرِ الٰہی کو نماز پر اس لیے افضل قرار دیا گیا ہے کہ کلمہ طیبہ وہ بنیادی ذکر ہے جس کے پڑھنے سے ایمان میسر آتا ہے اور ایمان کے بعد ہی نماز فرض ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے:

اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

یہ کلمہ عقیدۂ توحید سے متعلق ہو کر تمام عقائد کی بنیاد بن جاتا ہے اور جملہ عقائد اور عبادات و معاملاتِ اسلامیہ اس پر متفرع ہوتے ہیں۔ اس مقام پر اس اعتراض کا جواب کہ بعض اہلِ صلوٰۃ سے بے حیائی اور گناہ کا سرزد ہونا آیت کے منافی ہے۔ درحقیقت مذکورہ تمہید جو نفس و شیطان کے اضداد کے مقابلے سے متعلق ہے۔ صحیح ایمانیات پر عبادت کی ترکیب کی وضاحت کے لیے اس واسطے بیان کی گئی ہے کہ عبادات سچے ایمان پر مرتب ہونے کے بعد صاحبِ عبادت کو گناہ سے بچاتے ہیں اور اعترافِ گناہ کی تعلیم دیتے ہیں جو عبادت ایمان کی بناؤں پر کی جائے وہ یقیناً بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے جس کا ثبوت، انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کی متقیانہ عبادات سے ملتا ہے۔ ان کی سعادت مندیوں پر تاریخ اسلام مرتب ہوئی ہے جن سے کوئی باشعور انکار نہیں کر سکتا۔

بصورتِ دیگر کم ازکم اتنا مفہوم ہو جاتا ہے کہ نمازی سے حالتِ نماز میں کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ اس نماز میں عوام کی نماز بھی شامل ہے۔ نماز کے مجموعی اوقات کو جمع کیا جائے تو کم ازکم پانچ یا چھ گھنٹے بن جاتے ہیں۔ مہینے کے تیس ایام کو روزمرہ کے چھ گھنٹوں سے جمع کیا جائے تو ایک سو اسی گھنٹے بنتے ہیں اور ایک سو اسی گھنٹوں کے بارہ گھنٹے یومیہ کے حساب سے ۱۵ ایوم بنتے ہیں اور شب و روز کے ۲۴ گھنٹوں کے حساب سے ۱/۲ ۷ دن بنتے ہیں۔ اس تناسب سے ایک سال میں تین ماہ بنتے ہیں۔ اس حساب سے اصل کی بنا پر بلوغ سے لے کر ساٹھ سال کی عمر تک پندرہ سال بنتے ہیں اور خوش قسمتی سے اگر ۱۰۰ سال عمر ہو جائے تو اس کے ۲۵ سال بنتے ہیں۔

گویا جو شخص ۶۰ سال یا سو سال تک متواتر نماز پڑھتا رہے اور وہ صاحب الترتیب ہو تو وہ پندرہ سال اور پچیس سال مسلسل گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ اس واسطے کہ قیدِ نماز میں کسی فعلِ بد کا صدور نہیں ہو سکتا۔ پہلی صورت میں نماز کا تقوٰی پر انحصار ہے جس میں متقی کا ملاً بے حیائی اور بُری باتوں سے بچتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو گناہوں سے بچاتے ہیں۔ یہ خواص کی نماز ہے۔ اور دوسری حالت میں اوقاتِ نماز گناہوں سے بچاتے ہیں جو عوام کی نماز ہے۔ پندرہ سال اور پچیس سال یقیناً اللہ کے حضور میں اس کی نجات کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس واسطے بہر حال نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے۔ عبادتِ اسلامی، تہذیب و تمدن میں اخلاق کی بنائے اوّل ہے۔ اور انجام کار سعادت مندیوں پر انتہا کرتی ہے۔ جس میں دُنیا و عقبیٰ کی فلاح ثمر کے طور پر بندگی کرنے والے بندوں کو میسر آتی ہے۔

یہ لوگ راتیں اپنی کروٹوں پر اللہ کی عبادت میں بسر کرتے ہیں اور قائم اللیل

اور صائم النہار بن کر نفس و شیطان کا مقابلہ کرتے ہوئے سچائیوں کی تبلیغ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ناجی اور نجات دہندہ ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کے پاکباز بندے جن کے سینے محبتِ الٰہی سے سرشار ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں شفقت سے معمور ہوتی ہیں اور ان کا تبسم حیا بخش ہوتا ہے۔

ان کے اشارے اور کنائے بنی نوعِ انسان کے لیے پیغامِ رحمت ہوتے ہیں اور مصیبت میں، دُکھ درد میں، حادثات میں، حالتِ خوف میں، ہر حالت میں کامل صبر و شکر کے ساتھ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کے فرمانِ باری تعالیٰ کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں اور استقامتِ ایمانی کا کامل بندگی کے ساتھ ثبوت پیش کرتے ہوئے ہر میدان میں تائیدِ ایزدی حاصل کر کے سرفراز ہوتے ہیں۔ ان لوگوں پر ہمہ وقت رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔

قرآن مجید اور علمِ غیب

علمِ غیب کا کلیتہً صرف اللہ العالمین ہی مالک ہے۔ مگر علمِ عطائی سے انکار عطائے خداوندی سے انکار ہوتا ہے۔ عالم الغیب و الشہادۃ صرف اللہ کے لیے مختص ہے۔ مگر متقین کے علمِ غیب کے متعلق قرآن مجید کے پہلے پارہ میں سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات میں تصریحاً بیان موجود ہے جس کی موجودگی میں عطائی علمِ غیب سے انکار نہیں ہو سکتا اور انبیائے کرام کا علمِ غیب نبوت کے بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔

بدقسمتی سے اس چودھویں صدی ہجری میں تقریباً ۵۰ سال سے انبیاءؑ و اولیاءؒ کے عطائی علومِ باطل پر جو انہیں بالوحی اور الہامی طور پر من جانب اللہ عطا فرمائے گئے ہیں۔ علمائے اسلام میں بحث و تمحیص کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ انبیاءؑ کے الہامات، خواب اور کلام سب کے سب عندالقرآن وحی خفی و جلی سے تعبیر ہیں اور اولیاءؒ اللہ کے کشف و کرامات الہامی، القائی و ہاتفی ہوتے ہیں جو ان کے اسلامی زہد و تقویٰ سے پیدا ہو کر ایزادِ کرامت برائے تبلیغِ دین بنتے ہیں اور سب کے سب چاہے وہبی ہوں۔ یا اکتسابی۔ من جانب اللہ عطائی ہوتے ہیں۔

قرونِ اُولیٰ سے اس صدی تک ان حالات و کیفیات کو عوام و خواص میں یقین اور استحسان کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے اور ان کے ذریعے عوام کو تحریص و ترغیبِ اسلام ملتی رہی۔ اس پر چنداں بحث کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ حالات تعمیل احکامِ الٰہیہ کے نتیجے میں میسر آتے ہیں، مگر چونکہ انسانی نظریاتی مباحث کا سامنے آتے رہنا انسانی عادت کا خاصہ رہا ہے اور ان مباحث سے علمی و معلوماتی اضافہ ہوتا ہے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ اس پر روشنی ڈالی جائے۔

علمِ غیب کا کلیتہً صرف اللہ العالمین ہی مالک ہے۔ مگر علم عطائی سے انکار

عطائے خداوندی کا انکار ہوتا ہے۔ عالم الغیب والشہادۃ صرف اللہ کے لیے مختص ہے۔ مگر متقین کے علم الغیب کے متعلق قرآن مجید کے پہلے پارہ میں سورۃ بقر کی ابتدائی آیات میں تصریحاً بیان موجود ہے جس کی موجودگی میں عطائی علم غیب سے انکار نہیں ہو سکتا اور انبیاءؑ کرام کا علمِ غیب نبوّت کے بنیادی ارکان میں سے ایک رکن ہے۔

اخبارِ بالغیب، تبلیغ بالاخبار اور معجزات نبوّت کے تین بنیادی ارکان ہیں ان تینوں ارکان میں سے ایک رکن کی کمی واقع ہونے سے نبوّت ختم ہو جاتی ہے۔ ہر نبیؑ کا صاحبِ اخبار بالغیب ہونا اور ان اخبار کے مطابق تبلیغ کرنا اور منجانب اللہ صاحبِ معجزات ہونا لازم ہے۔ نبوّت کی بنائے اوّل جس پر وہ دعوٰئِ نبوّت کرتا ہے۔ اخبارِ بالغیب ہے۔ دوسرا درجہ تبلیغ بالاخبار ہے اور تیسرا درجہ منکرینِ اخبار کی عقول کو عاجز کرنے کے لیے صفتِ معجزانہ ہے۔

چنانچہ قرآن مجید و فرقانِ حمید اور احادیثِ نبوّیہ سے تمام انبیاءؑ کے لیے ان تین ارکان کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ایک لاکھ کئی ہزار انبیاءؑ ہوتے لیکن یہ تعداد قطعیت کے ساتھ اسواسطے نہیں پیش کی گئی کہ اس میں حضرت لقمان علیہ السّلام اور حضرت خضر علیہ السّلام دو ایسی شخصیات ہیں جن کے متعلق اخبار، تبلیغ اور معجزہ کی مکمل شہادت نہیں ملتی۔ ورنہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد قطعی حساب سے پیش کی جا سکتی تھی۔ اسی احتیاط کے پیشِ نظر ایک لاکھ چوبیس ہزار کی بجائے ایک لاکھ کئی ہزار کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔

اس اعتبار سے مذکورہ ارکانِ نبوّت کی موجودگی میں انبیاءؑ کے علم غیب سے

انکار کرنا اخبارِ بالغیب کے انکار کے مترادف ہے۔ جس سے نبوّت کا بنیادی انکار ہو جاتا ہے۔ اور ایسے دلائل کی موجودگی میں علماءِ معترضین کا انبیاءؑ کے علم غیب سے انکار کرنا نبوّت کی اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ تخصیصِ نبوّت کے دلائل اسلامیہ کے منافی ہے۔ اللہ اور نبیؐ دونوں کی تعمیلِ حکم کی بدولت جو لوگ صدّیقین اور صالحین کا مرتبہ پاتے ہیں۔ ان کی عاداتِ کریمانہ اور کلام عارفانہ عام لوگوں کے ادراک سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔ ان کا تقرّب حاصل کرنا علمائے حق کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ اس واسطے کہ یہ لوگ صاحبِ وجدان ہوتے ہیں۔ ان سے اللہ کی محبّت کی راہ ملتی ہے اور ان کا تقرّب کفارۂ گناہ ہوتا ہے۔

عارف کا عالم کے پاس بیٹھنا اور عالم کا عارف کے قریب ہونا، علمِ عالم کو عرفان کی نعمت سے مالا مال کرتا ہے اور عارف کو حالتِ وجدان میں علماء کی نگرانی میں شریعت کی پابندی کا شرف ملتا ہے۔ وہ اپنے سُکر کو علماء کی محفل میں صحو تک محدود رکھ کر ارکانِ شریعت کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔

درحقیقت علماء ہی اولیاءاللہ بن کر عارف باللہ کا مقام حاصل کرنے کے صحیح مجاز ہیں۔ منزلِ عرفان راہِ علم سے میسّر آتی ہے۔ ولی اللہ جس طرح بھی ولی اللہ بنے اس کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم سے بہرہ ور کیا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

رقابت علم و عرفان میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاّج کی سُولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

یہاں علمِ غیب اور علمِ شہود کی بحث مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اصل الاصول سے چل کر اس کی منزل کے مطابق رختِ سفر باندھ کر مقصودِ مطلق کو پانا ہے۔ مقصودِ مطلق کو پانے کے لیے غور و فکر کرنا تحقیقِ حق کے لیے ضروری ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ علماء و عرفاء جادۂ حق پر جسے اصطلاحِ تصوّف میں راہِ سلوک کہتے ہیں بحث و تمحیص کو اجتہادِ علم و عرفان برائے حصولِ مقصد کہا جائے گا اور تلاشِ حق میں عند الاسلام علماء اور عرفاء کی اجتہادی غلطیاں قابلِ معافی ہوتی ہیں اور ان کو ظنِ خیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مگر جب علمائے اسلام ایسی بلندی سے نیچے اُتر آئیں اور اپنے مباحث عقل و نفس کی سطح پر مرتب کرنے شروع کر دیں تو بجائے استفادۂ علمی کے رقابت کا دَور دورہ شروع ہو جاتا ہے جس سے علم کی وہ ارتقائی اصطلاحات جو عروجِ علم و عمل کے لیے راہنما ہوتی ہیں۔ رقابت کی بناء پر اختراعاتِ نافلیہ کا شکار ہو کر صورتاً مسخ ہو جاتی ہیں جس سے آنے والے طلبائے علم و عمل کو راہِ علم و عمل دریافت کرنے میں سخت دقت پیش آتی ہے اور علم و عمل کے جہانوں میں ان بے جا مباحث سے اس قدر آندھیاں اور طوفان آ جاتے ہیں جن سے علم و عرفان کے بار آور چمن اور میسّر آئے ہوئے معلومات بکھر کر پامال ہو جاتے ہیں جس کی تلافی صدیوں تک بھی نہیں ہو سکتی۔

اصطلاحِ قرآن میں مذہب کی بنیاد غیب پر رکھ کر مومن کو مستور و محجوب حالات کے لیے تجسّس کا موقع دیا گیا ہے۔ اگر بناءِ اوّل علمِ شہود پر ہوتی تو تجسّس کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا۔ جستجو شہود کے لیے نہیں ہوتی اس لیے کہ وہ سامنے

ہوتا ہے۔ بلکہ غیوب کے لیے ہوتی ہے۔ اس واسطے کہ شہود ظاہر ہے اور ظاہر وباہر اشیاء کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور غیوب مشہود و محجوب چیزیں ہیں۔ قابلِ معلوم ہیں۔ ان کو معلوم کرنا فتوح الغیب ہے۔

اللہ کی راہ میں فتوح الغیب کا آغاز یومنون بالغیب سے ہوتا ہے۔ غیب پر ایمان لانا شہود کے منافی ہے اور شہود پر ایمان لانا غیب کے منافی ہے۔ یہاں غیب پر یقینِ محکم کے ساتھ ایمان کی تلقین کی جاتی ہے اور تقوٰے کی شرطِ اوّل ایمان بالغیب رکھی ہے اور اس پر جن اعمال کو مرتّب کیا گیا ہے۔ وہ سب کے سب مشہود ہیں۔ اس ترتیب سے جملہ اعمالِ اسلامیہ کی تعمیر علمِ غیب پر ہوئی اور جن اعمال کی تعمیر غیب پر ہو ان کی اصل بھی غیب ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کے سامنے ہر چیز شہود ہی شہود ہے۔ کیوں کہ اس کے سامنے غیب کا وجود ہی نہیں۔ غیب دان کی اصطلاح اُن کے لیے ہے جن پر غیب عیاں نہیں اور وہ اس کے دیکھنے کی جستجو کرتے ہیں اور خدا پر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آسکتا کہ اس سے کوئی چیز پوشیدہ رہے۔ نہ اس کو اُونگھ آتی ہے نہ نیند۔ یہ تصوّر بھی کرنا کہ وہ غیب دان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علمِ قدیم پر نقص لازم آتا ہے اس واسطے کہ غیب دان کے لیے اشیاء کا مستور و محجوب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ البتہ عالم الغیب والشہادۃ کا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ جو چیزیں تم سے پوشیدہ ہیں وہ اللہ سے پوشیدہ نہیں۔ وہ علیمٌ بذاتِ الصدور ہے۔

اُس کا علم محیطِ کل ہے اور انبیاءؑ و اولیاءؒ کا علم اس کی عطا ہے۔ عطا کرنا اللہ کی شان میں داخل ہے۔ عوام کو عام چیزیں عطا کرتا ہے اور خواص کو خاص چیزیں

عطا کرتا ہے۔ اخص الخواص کو اُن سے بھی زیادہ اعلیٰ چیزیں تفویض کرتا ہے۔ تاکہ عطائے ربانی کے درجات کا تعارف ہو سکے۔ چونکہ اسلام میں انبیاءؑ کا درجہ سب سے بلند ہے لہٰذا ان کے علوم و معارف اور مشاہدات کو بھی عوام و خواص سے بلند تر کر دیا جاتا ہے اور لوگوں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انبیاءؑ سے جو محیّر العقول کارنامے سرزد ہوتے ہیں ان کو معجزانہ خوارقات سے تعبیر کیا گیا اور اولیائے عظّام سے جو باتیں سرزد ہوں ان کو کرامات کہا گیا ہے۔

برخلاف ان کے سامری کی چال اور کفّار کے غیر اسلامی مصنوعی احوال سے جو حیرت انگیز حالات پیدا ہوں ان کو استدراج کہا گیا ہے۔ چونکہ غیر مسلمین کی اس حیرت انگیزی کی بنیاد ایمان بالغیب پر نہیں ہوتی بلکہ خارجی مصنوعی علوم و فنون کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی واسطے وہ اخبارِ تبلیغ اور معجزات و کرامات سے الگ کر دیے گئے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کا مقصد تقویٰ حاصل کرنا ہے۔ اور تقوے وہ مقام ہے جس سے خوشنودیٔ رب حاصل ہوتی ہے اور خوشنودیٔ رب ہی متقی کے لیے کرامت بن جاتی ہے۔ متقی کی خوشنودی اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے اور متقی کا غضب اللہ کے غضب کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

متقیوں کی اللہ تعالیٰ ہر حال مدد کرتا ہے۔ ان پر الہامات کا سلسلہ بھی خوشنودیٔ رب ہی کی ایک کڑی ہے۔ علمِ غیب سے مراد راہ پانے کے ہیں۔ انبیاءؑ زیادہ راہ پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کا قول فرمانِ باری ہوتا ہے۔ اور اولیائے اللہ

سب کے سب اطاعت شعار ہونے کی بدولت راہِ حق پاتے ہیں۔ یہ لوگ علومِ تکوینیہ سے بھی مطلع ہوتے ہیں۔

علم غیب اللہ کے لیے ہے۔ اِس حالت میں کہ ہر چیز اللہ کے سامنے شہود ہے۔ اور علم غیب عطائی وہ ہے جو اللہ کے حکم و قدرت سے میسّر آئے۔ اس عقیدے سے مفرِ اللہ کے علمِ شہود اور عطائے خداوندی سے انکار ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے علمِ شہود یہ بلا غیب اور عطائے علمِ غیب مِن جانب اللہ کے اعتبار سے انبیاء علیہ الصّلوٰۃ والسلام جو بات جس وقت اور حال میں کرتے ہیں وہ وقت اور حال دونوں ان کے لیے مشہودؔ ہوتے ہیں۔ کیفیّتِ مشہود پر علم الغیب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ اور اولیائے اللہ پر بھی فتوح الغیب کا سلسلہ جس وقت اور جب جاری کیا جاتا ہے۔ ان پر بھی وہ وقت اور حالات کیفیّتِ مشہودہ کی طرح واقع ہوتے ہیں۔

لہذا کوئی نبیؑ، کوئی ولی بغیر دیکھنے کے علم الغیب کی بات نہیں کرتے۔ جو چیز ان پر واضح ہوتی ہے اور جو چیز وہ آنکھ سے دیکھتے اور کانوں سے سُنتے ہیں۔ اِس کو زیرِ عمل لاتے ہیں۔ اس طرح انبیاؑ و مشائخ پر عالم الغیب ہونے کا فتویٰ نہیں لگ سکتا۔ اسی طرح شریعت میں انبیاؑ کے مشاہدات کو قطعی کہا گیا ہے اور اہل اللہ کے مشاہدات انبیاؑ کی طرح قطعی نہیں ہوتے مگر ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اہل اللہ کے مشاہدات درجات کے لحاظ سے بعض دفعہ سو فی صد، نوّے فی صد، بعض دفعہ نصف فی صد، بعض دفعہ دس فیصد اور بعض دفعہ ایک فیصد صحیح ہوتے ہیں اور یہ سب انکشافات بربنائے تقویٰ اسلام ہو کر سامنے آتے

ں۔ جن سے تبلیغِ اسلام کا کام سرانجام دیا جاتا ہے۔ اہل اللہ کے نزدیک کشف برائے
شف جس کا تعلق تبلیغ دین سے نہ ہو ناجائز ہے اور بے فائدہ ہے۔ یہ
ہ کرامات ہیں جو کلمہ طیبہ سے شروع ہو کر مومن کے قول و فعل سے شروع ہو کر
ارقاتِ اولیاء اللہ تک ختم ہوتے ہیں۔

چنانچہ سورۃ بقر کی ابتدائی آیات کو ایمان بالغیب کی دلیل کے طور پر پیش کرتے
ئے مزید روشنی ڈالی جاتی ہے:۔

الٓمّٓ ذٰلِكَ

كِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ
صَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۚ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ
بِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ
مْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۚ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ
غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

سورۃ بقر کی ان آیات کا ترجمہ یہ ہے کہ "یہ وہ کتابِ مقدس ہے جس میں
ی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا اور اس میں کسی قسم کے شک اور غلطی کی
ائش نہیں ہے اور اس کتابِ مقدس کی ہدایات متقیوں کے لیے مختص ہیں۔
پرہیزگار جو خدا تعالیٰ کی ذات پر بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور پھر اس
ان کے بعد اللہ کے احکام کے مطابق اس کی نماز ادا کرتے ہیں اور اللہ نے جو
دے رکھا ہے اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ
ے آخری کتاب قرآن مجید جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمائی

ہے اس پر یقین رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئی ہیں یعنی تورات، زبور، انجیل اور دیگر کتبِ سماویہ پر ایمان رکھتے ہیں اور یومِ آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

ان لوگوں کے متعلق اس سورۃ مقدسہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کہ اس قسم کے ایمانیات کے جو لوگ مالک ہیں۔ وہی فلاحِ دارین کے حق دار ہیں جو لوگ اس کے خلاف چلنے والے ہیں انہیں قرآن مجید میں کافر کہا گیا ہے۔ یعنی وہ دیدہ ودانستہ پروردگارِ عالم کے حق ہونے سے انکار کرنے والے اور اللہ کی ہدایت سے پھر جانے والے ہیں۔

یہ کتاب، کتابِ موعود ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہود ونصاریٰ سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں تمہیں نبیٔ آخر الزماں صلی اللہ علیہ واصحابہ وسلم کے ذریعے ایک کتاب بھیجوں گا جو آخری کتاب ہوگی۔ جس وقت یہ کتاب نازل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کو اپنا وعدہ یاد دلایا کہ یہ کتاب موعود وہی ہے جس کے متعلق میں نے تم سے وعدہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔

اس کتابِ مقدس میں جو الفاظِ مبارک الٓمٓ تا وَالنَّاس ہیں۔ وہ قرآن مجید ہیں اور قرآن مجید اپنے جملہ اجزاء کے ساتھ کتابِ موعود ہے اور ساری کی ساری کتاب اور اس کے اندر جو کچھ بھی ہے وہ سارے کا سارا اتقیاء کے لیے ہے اور سب سے زیادہ اگر اس سے انتفاع کرنے والے لوگ ہیں تو وہ اللہ کی ذات پر ایمان رکھنے والے لوگ ہیں کیونکہ تقویٰ وہی تقویٰ کہلا سکتا ہے جو شریعت سے اخذ کیا جائے۔ اگر خارجی ہو، تو اس پر تقویٰ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ شرعی حدود کے اندر رہ کر شرعی امور کے

تابع احکام کی تعمیل کی جائے تو اس کو تقویٰ کہتے ہیں۔ وہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے۔

ان لوگوں کو متقی کہا جاتا ہے جو شریعت کی روشنی میں کام کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق ارشاد فرمایا کہ یہ کتاب مقدس ان لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان ہے جو شریعت کی روشنی میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کرنے والے اور شریعت کی روشنی میں انسانیت کی خدمت کرنے والے ہیں۔ ان کے سوا جو لوگ ہیں انہیں متقی نہیں کہا جاتا۔ وہ متقی جو شریعت کی روشنی میں اپنے لیے اقوال واعمال تجویز کرتے ہیں ان کی کیا تعریف ہے؟ فرمایا:۔

ان کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات واجب الوجود پر بغیر دیکھے ایمان لائیں۔ یہی ایمان بالغیب ہے جو اسلامی جماعت کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اگر یُؤمِنُونَ بِالشُّهُودِ ہوتا پھر شہود سے بات شروع ہوتی۔ اور یؤمنون بالشہود ہوتا تو اللہ کی ذات کو دیکھ کر آسمان سے کتابیں اُترتی ہوئی دیکھ کر اور آخرت کا مشاہدہ کر کے لوگ ایمان لاسکتے تھے۔ یا قبریں پھٹتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بعثت بعد الموت پر ایمان لاتے۔ اس کو یُؤمِنُونَ بِالشُّهُودِ کہا جاتا۔

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ چونکہ پوشیدہ ہے۔ حضور اکرم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم اور انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والتسلیم کو نبوت کی مہریں لگائی گئیں یا نبیؑ بنا کر بھیجا گیا تو انہوں نے آکر اپنی مبارک زبانوں سے کہا کہ ہم نبیؑ ہیں۔ وہ معجزات بھی اپنے ساتھ لائے تھے اور دلائل بھی جو عین فطرت تھے۔ کچھ لوگوں نے انہیں تسلیم کیا اور کچھ لوگوں

نے انکار کیا۔

جنہوں نے تسلیم کیا انہوں نے بالغیب تسلیم کیا۔ کیونکہ وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ جس وقت ان کو نبوت تقسیم ہو رہی تھی۔ اس واسطے یہ ایمانیات سب کے سب یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ہیں لہذا بنیاد رکھی گئی یومنون بالغیب پر۔ غیب کے معنی پوشیدہ کے ہیں۔ تمام لوگ جانتے ہیں کہ اعدام متقابلہ، تد مقابل کے چھوٹے چھوٹے غیوب سے لے کر اللہ کی ذات تک سب چیز پر غیب کا لفظ بولا جاتا ہے۔

زمین جس پر تم بستے ہو۔ اس کے اندر خزانے ہیں اور تمہیں اس کا علم بھی ہے لیکن تم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ لہذا وہ غیب ہیں۔ طبقات الارض میں بہت سی ایسی اشیاء ہیں جو مستور و محجوب ہیں۔ ان سب پر غیب کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ فرمایا گیا ہے۔ ہمارا ایک ایمان نہیں، بلکہ بہت سے ایمان ہیں۔ ایمان کے متعلق آپ نے صفتِ ایمانی میں پڑھا ہے۔ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ۔ یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے کہ میں فردِ واحد اپنے حواسِ خمسہ کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں اللہ کی ذات وحدہٗ لاشریک پر ایمان لاتا ہوں کہ وہ ایک ہے۔ حالانکہ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں ہے۔ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ اس کے فرشتوں پر بھی ایمان رکھتا ہوں۔ حالانکہ میں نے اس کے فرشتوں کو بھی دیکھا نہیں ہے۔ وَکُتُبِہٖ اس کی جتنی کتابیں آسمان سے اتری ہیں ان سب پر ایمان رکھتا ہوں حالانکہ اس کی ایک بھی کتاب کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھا ہے۔ وَرُسُلِہٖ اور اس کے ایک لاکھ کئی ہزار انبیاء پر ایمان رکھتا ہوں۔ حالانکہ ان میں سے کسی ایک پر بھی مہرِ نبوت ثبت ہوتے ہوئے نہیں دیکھا کہ کب مہرِ نبوت ثبت کی گئی ہے۔

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ یہ تو بعد میں آنے والا مسئلہ ہے مستقبل کی ہر چیز ہم سے پوشیدہ ہے اور قیامت ہم سے دُور ہے۔ آنے والے زمانے میں آئے گی۔ اس پر بھی ہم ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ایک فردِ واحد آخرت پر ایمان رکھتا ہوں جو آئندہ آنے والی ہے۔ یہ بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔

وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ نیکیاں اور بدیاں اللہ کی مخلوق ہیں اور اللہ ہی کی طرف سے ہیں۔ ہمیں اس کے متعلق بھی علم نہیں ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ وہ اس کی طرف سے ہیں۔ لہٰذا ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ بھی بالغیب ہے۔ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔ مرنے کے بعد اُٹھنے پر ایمان رکھتا ہوں۔ حالانکہ کسی شخص کو مرنے کے بعد اٹھتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وُہی متقی ہیں جو بن دیکھے ایمان رکھنے والے ہیں۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ۔ وہی اللہ جس کو میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے۔ اُس کی ذات پر ایمان رکھتا ہوں۔ ایسے ایمان رکھتا ہوں جیسے وہ اپنے اسمائے صفات کے ساتھ ہے۔ جس طرح شریعت نے فرمایا ہے کہ اس کے اسما بھی ہیں اور صفات بھی ہیں۔ ہم نے جس اللہ کو دیکھا نہیں ہے اس کی صفات اور اس کے اسماء کے ساتھ اُس پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔

وَ قَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ۔ اس کی طرف سے جتنے بھی احکام انبیائے کرام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ذریعے دُنیا پر نازل ہوئے۔ ان سب پر ایمان لاتا ہوں۔ ان سب کو قبول کرتا ہوں۔ اور یہ قبولیت اس طرح ہے کہ میں ایسے ایمان لاتا ہوں جیسے

ان کو دیکھ چکا ہوں، بلکہ دیکھنے والوں سے بھی زیادہ پختہ ایمان لا چکا ہوں۔ قبول اسی چیز کو کیا جاتا ہے جس پر انسان تصدیق کرے۔ یہ تصدیق زبان سے ہی نہیں، بلکہ میں تصدیق کرتا ہوں۔ دل کے ساتھ۔ تاکہ منافقت سے بچ سکوں۔ یہ ایمانیات ہیں جو سب کے سب بالغیب ہیں۔

شریعت کی روشنی میں تعلیم دیے گئے ہیں۔ یہ خارجی تعلیم نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی عالم فاضل، کوئی دیدہ ور، کوئی مفکر مسلمان ثابت نہیں کر سکتا کہ ایمانیات کی جو یہ تعلیم دی گئی ہے۔ اسلام کی داخلی نہیں بلکہ خارجی ہے یہ داخلی شرعی تعلیمات میں سے ہے اور اس پر اعمال کی تعمیر کی جاتی ہے۔ جس پر سب جمہور علماء کا اتفاق ہے۔

فرمایا گیا کہ جو شخص غیب پر اپنے ایمان کو مضبوط نہ کر سکے اور اس پر استقامت حاصل نہ کر سکے۔ عالم شہود میں، عالم ہست و بود میں وہ اعمال کو شرعی امور پر متشکل نہیں کر سکتا بلکہ جو شخص بنیادی امور پر ایمان نہیں رکھ سکتا۔ اسے اعمال شرعیہ کی تعمیل کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ وہ اتقیاء جو شرعی روشنی میں فیصلہ زندگی کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کی تعریف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بن دیکھے ایمان لانے والے لوگ ہوتے ہیں۔

نماز کس کی پڑھی جاتی ہے؟ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ کے الفاظ مبارکہ ہیں۔ ہم سب کو علم ہے اور سارے علمائے کرام نے آج تک یہی تعلیم دی ہے کہ نماز اللہ کی پڑھی جاتی ہے۔ غیر کی نماز نہیں ہو سکتی۔ اب آپ جس معبود کی نماز پڑھ رہے ہیں وہ آپ کا بن دیکھا معبود ہے تو پھر اس کی نماز بھی بالغیب ہوئی جسے آپ نے دیکھا ہی نہیں ہے اس کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس لیے ثابت ہوا کہ نماز بھی بالغیب ہے۔

يُقِيمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

جو اللہ تعالیٰ نے اتقیاء کو دیا ہے۔ جان و مال، اولاد، سامانِ زندگی، اس
میں سے وہ اللہ کے راستے میں انفاق کرنے والے ہیں اور انفاق شریعت میں وہی
ثواب سمجھا جاتا ہے جو اللہ کے لیے دیا جائے۔ لیکن جس اللہ کو آپ نے نہیں دیکھا
اس کی راہ میں انفاق کا حکم دیا جاتا ہے۔ گویا انفاق بھی بالغیب ہوا۔

بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ

اے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے اُوپر جو آخری کتاب یعنی قرآن
مجید نازل ہوئی اس پر بھی پورا پورا یقین رکھنے والے ہیں۔ یہ ایمان بالکتاب کتاب سے متعلق ہے
اور نزول اس اللہ کی طرف سے ہے جس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ کتاب پر ایمان لانا بھی بالغیب
ہی ٹھہرا۔ کیونکہ کتاب کو اُترتے ہوئے ہم نے نہیں دیکھا۔ جب آخری نبی
علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر آخری مہر لگی۔ اس وقت بھی ہم موجود نہ تھے۔ یا ہم کو دکھا کر
مہر ثبت نہیں کی گئی تھی۔

قرآن مجید کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں۔

يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ

ہم نے آپؐ کو جو فرمان جاری کیے ہیں۔ ان کو لوگوں تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دو۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمانِ الٰہی کے مطابق اس کتاب مقدس کو لائے
اور اس کے احکام دنیا تک پہنچا دیے۔

اس سے قبل یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے پہلے حضرت
عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر انجیل نازل ہوئی۔ اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ

والسلام پر توراۃ نازل ہوئی۔ یہ ہیں وہ کتابیں جن کو نازل ہوتے ہم نے نہیں دیکھا مگر ان کے متعلق فرمایا گیا کہ تمہیں ضرور ان پر ایمان لانا ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک پر بھی ایمان نہیں لاؤ گے تو تم صاحبِ ایمان ہی نہیں رہو گے۔ اور یہ بھی ایمانِ بالغیب ہے۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ سارے جہان کے مسلمان جانتے ہیں کہ قیامت آئے گی۔ ہم مریں گے۔ مرنے کے بعد برزخ کی زندگی آئے گی۔ اس کے بعد میدانِ حشر آئے گا۔ جزا اور سزا کا وقت آئے گا۔ اگرچہ یہ سب کچھ ہم سے پوشیدہ ہے لیکن ہم اس طرح ایمان لا رہے ہیں جیسے کہ وہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر ہم اس میں شک جائیں تو ایمان میں نقص واقع ہو جائے گا۔

یہ بالغیب ایمانیات ایک مومن کے لیے شرطِ اوّلین قرار دی گئی ہیں اور ایسے لوگوں کو ہی متقی کہا گیا ہے۔ یعنی وہی شخص متقی ہو سکتا ہے۔ جو ان غیوب پر ایمان لائے ایمان بالغیب کی ان آیات میں چھ شرائط ہیں:

فرمایا: اُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ ان ہی ایمانیات پر استقامت پانے والے مومنین۔ یہی بالغیب ایمان لانے والے انسان فلاح و نجات پائیں گے۔ برخلاف اس کے جو لوگ مظاہراتِ عالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ لیل و نہار کی گردش دیکھتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک معصوم بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے بڑھتا ہے اور تابناک جوانی حاصل کرتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ ان مظاہرِ عالم کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ جو خود دلیل ہیں۔ منظوماتِ عالم اِس امر کی دلیل ہیں کہ کوئی ناظم ان کے پیچھے موجود ہے۔ باوجود ان دلائل کے جو لوگ انبیاء کرام

ی فطری تعلیم سے انکار کرتے ہیں اور خدا کو تسلیم نہیں کرتے ان کو منکرین کہا
گیا ہے۔

پہلے مؤمنین کا ذکر کیا۔ پھر اتقیاء کے لیے ہدایات سماوی کو مختص فرمایا کہ
گر بالاختصاص ہدایت حاصل کرنے والے ہیں تو وہ متقی اور پرہیزگار ہیں۔ اس میں
متقی کی تعریف بیان کی ہے کہ متقی وہ ہو سکتا ہے۔ جو شرعی روشنی میں سب
فیصلے کرے۔

شرعی روشنی میں وہ کہتا ہے کہ میں اللہ پر ایمان لایا ہوں اور ہر غیب پر
س کی شریعت نے نشان دہی کی ایمان لایا ہوں۔ بالشہود کا کہیں شائبتہً ذکر نہیں
ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر ایک عام مسلمان نے آج تک یہی
فیصلہ کیا ہے۔ یعنی یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ۔ آپؓ کو صدیق اس لیے کہا گیا ہے کہ آپ
نے ایک خواب دیکھا تھا کہ آپ دربار مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ خواب بیان فرمادیا۔ آپ نے تصدیق کرلی
خدا کو بھی مان لیا، یوم آخرت کو بھی اور آپ صدیق ہوئے۔

خلفائے راشدین جملہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ایمان بالغیب
رکھتے تھے۔ ان میں ایک مومن بھی ایسا نہیں تھا جو ایمان بالشہود لایا ہو۔ یاد
رکھنا اس بات کو۔ شہود صرف انبیاءؑ کے لیے ہے اور غیب ہم مومنوں کے لیے ہے۔
غیب پر استوار ہو کر اگر ہم ارتقائی درجات حاصل کرلیں تو شاید شہود میسر
آجاتے۔

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔

ترجمہ: یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

فرمایا کہ خلاف اس کے جو لوگ مظاہرات عالم کو دیکھتے ہوئے انبیاءؑ کی تعلیم فطرت کو پاتے ہوئے علی الاعلان خدا کی ذات سے انکار کرتے ہیں وہ دیدہ و دانستہ حق سے اعراض کرنے والے ہیں اور مومن دیدہ و دانستہ غیوب پر ایمان لاتا ہے۔

فاترالعقل اور مجنوں انسان غیر مکلّف قرار دیے گئے ہیں کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو ان پر کافر ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا لیکن جو صحیح العقل ہو اور کفّار کے زمرے میں داخل ہو اس کو مکلّف قرار دیا گیا ہے۔ اس کو اسلام میں کافر کہا جاتا ہے۔ جو دیدہ و دانستہ حق سے اعراض کرے اور فطری تعلیمات سے منہ موڑے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیدہ و دانستہ حق سے اعراض کرنے والے منکرین حق کو برابر ہے کہ آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

ان کی مثال ایسی ہے کہ ایک انسان سو جاتا ہے۔ اگر ہم اس کو جگائیں تو وہ جاگ اٹھتا ہے لیکن ایک شخص سویا ہوا نہیں ہے بلکہ ویسے ہی دوسروں کو فریب میں ڈالتا ہے۔ دیکھنے والا اس کو نیند میں مبتلا سمجھ کر آواز دیتا ہے کہ جاگو۔۔ وہ نہیں جاگتا۔ اسے بار بار آواز دی جاتی ہے۔ وہ پھر بھی نہیں جاگتا۔ وہ کیا جاگے جو دیدہ و دانستہ ضد کر رہا ہے۔ اس کو جگانا نہ جگانا دونوں برابر ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کافر کو مسلمان

نہیں کر سکتے تھے۔ معجزہ کے معنی اسلامی تعلیمات میں کسی چیز کی ذات کو تبدیل کر دینا۔ اس کو چیر پھاڑ کر رکھ دینا، اس کی ہیئت کو بدل دینا ہیں خواہ وہ ازلی ہو یا ابدی۔ یا کسی وقت بھی واقع ہونے والی حادث شے ہو۔ یہ معجزہ ہے۔ مختوم ازل ہو یا غیر مختوم۔ چونکہ وہ اپنی ذات کا پیکر ہے اس لیے ذات کو معجزہ بدل سکتا ہے۔ ان لوگوں کو مختوم ازل اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ دیدہ دانستہ ضد کرنے والے ہیں۔ باوجودیکہ وہ جانتے ہیں۔ یا رسول اللہ کہ آپؐ سچے نبی ہیں وہ خدا کی وحدانیت کو بھی جانتے ہیں، لیکن دیدہ و دانستہ ضد کرتے ہیں اس واسطے میں نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔ وہ مختوم ہیں اور سزا کے طور پر مختوم کر دیے گئے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۔

مومن اور کافر میں کیا فرق ہے؟ مومن وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر شریعت کی روشنی میں بن دیکھے ایمان لائے۔ فرشتے اللہ کی مخلوق ہیں۔ خالق نہیں ہیں۔ اس مخلوق پر ایمان لانے کی ہمیں تاکید فرمائی گئی ہے۔ خالق کی موجودگی میں مخلوق پر ایمان لانے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اسے بھی بنیادی ایمانیات میں داخل کر دیا گیا ہے۔ سب رسولؐ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ ان کی بعثت اللہ کی تخلیق ہے۔

ان سب پر ایمان لانے کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ یہ سب بنیادی مسائل ہیں۔ مثلاً ایک شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ پر ایمان رکھتا ہوں لیکن فرشتوں کو نہیں مانتا تو اس کے متعلق اسلام کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔

ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں لیکن انبیاء پر ایمان نہیں رکھتا۔ عندالاسلام وہ بدستور غیر مسلم ہے۔ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر تو ایمان رکھتا ہوں لیکن اس کی کتابوں پر ایمان نہیں رکھتا، یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے متعلق اسلام کا فیصلہ ہے کہ وہ بدستور غیر مسلم ہے۔ یہ بنیادی اور تفصیلی عقائد ہیں جنہیں تسلیم کرنا ضروری ہے اور ان تمام عقائد کی جڑ توحید ہے۔

اب بحث طلب بات یہ ہے کہ ہمارا بنیادی مسئلہ یُؤمِنُونَ بِالْغَیْبِ ہے یُؤمِنُونَ بِالشَّھُودِ نہیں ہے تو پھر ترجمہ یہ ہوا کہ ہمارے جُملہ اعمالِ اسلامی کی تعمیر صرف یُؤمِنُونَ بِالْغَیْبِ پر ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ اگر آپ جائیداد تقسیم کر رہے ہیں، یتیم کے مال کی حفاظت کر رہے ہیں۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کر رہے ہیں، اولیائے کرام اور انبیائے عظام کی عزت کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ شرعی روشنی میں ایسا کر رہے ہیں اور شرعی تعلیم وہ ہے جو علام الغیوب کی طرف سے آپ کے پاس بھیجی گئی ہے۔

یہ ترجمہ ایسا ہے کہ لوگ بنیادی طور پر علم غیب سے واقف ہو جائیں اس سے معلوم ہوا کہ ساری ملتِ اسلامیہ علمِ غیب پر اپنے اعمال کی بُنیاد رکھتی ہے۔ دُنیا کا کوئی مسلمان اگر شرعی طور پر کہے کہ میں علمِ غیب کے اُوپر اپنے اعمال کی بُنیاد نہیں رکھتا تو ہم اس کو مسلمان ہی تصور نہیں کرتے۔ جب وہ مسلمان ہی نہیں ہے تو اس کے اعمال بھی غیر اسلامی ہوں گے۔ لہذا یہ ہمارا بنیادی مسئلہ ہوگیا ہے جس کے بغیر ہم اعمالِ اسلامی کی تعمیر ہی نہیں کر سکتے۔

ہماری تعلیمات ہیں اللہ عالم الغیب ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ ایک علم ناقص ہے اور ایک علم کامل ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ کا علم ہی اس کی صفت نہیں ہے بلکہ طاقت بھی اس کی صفت ہے بغنا بھی اس کی صفت ہے خبیر و علیم بھی ہے۔ ستار و غفار بھی ہے اور جبار و قہار بھی ہے۔ سمیع و بصیر بھی ہے۔

لیکن اس کو علم غیب تک محدود کر دیا کہ وہ صرف عالم الغیب ہے۔ لہٰذا کوئی علم غیب کی بات ہی نہ کرے۔ یہ ظلم ہے آپ کے اور میرے جسم میں بھی کچھ قوت و طاقت موجود ہے۔

اگر خدا البصیر ہے تو ہم بھی آنکھیں رکھتے ہیں۔ وہ سمیع ہے تو ہم بھی سنتے ہیں۔ وہ کلام کرتا ہے تو ہم بھی بولتے ہیں۔ اگر خدائے تعالیٰ زندۂ جاوید ہے تو ہم بھی کچھ مدّت کے لیے زندہ رہتے ہیں۔

اس کے متعلق بھی بحث کرنی پڑے گی۔ تب کہیں جا کر یہ مسئلہ حل ہوگا۔ یہ کہنا کہ علم غیب پر کوئی بات نہیں کر سکتا۔ ایک جزوی بحث ہوگی۔ علم اور اس کے اقسام کو بھی زیرِ بحث لانا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا علم کامل ہے اور دوسرے علم ناقص ہیں۔ محدود و بند ہیں۔ ایک بچّہ الف پڑھتا ہے اس سے آگے نہیں پڑھ سکتا تو اس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس کا علم الف تک محدود ہے اور یہ علم عطائی ہے کہ پروردگارِ عالم نے اس کو ایک الف عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا کوئی بندہ اس کے علم سے انکار نہ کرے۔ اگر انکار کریگا تو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے انکار کرے گا۔ اَللّٰہُ ایک بچّہ کو الف تقسیم کرتا ہے۔ ایک بچّہ ب بھی جانتا ہے اور قاعدہ پڑھتا ہے۔ ایک اس کے آگے کتاب

جانتا ہے اور تفسیر پڑھتا ہے۔ ایک منطق و معقول پڑھ لیتا ہے اور ایک اس سے بھی زیادہ عرفان حاصل کر لیتا ہے۔ یہ سب عطائی ہیں۔ ایک الف سے لے کر عرفان تک عطائی علم ہیں۔

عرفان کے ساتھ خدائے لم یزل کا تقرّب حاصل ہوتا ہے یعنی قربت حاصل ہوتی ہے۔ یاد رکھنا علم سے اللہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ علم، علم الیقین ہوا اور جب مجاہدات کرنے سے اس آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اسے عین الیقین کہتے ہیں۔ جس سے مظاہراتِ عالم کے بعض اسرار و بھید پر ظاہر ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ اس کا یقین اس قدر پختہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز اس کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتی اور وہ حق الیقین کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔

اللہُ کے علم کی صفت یہ ہے کہ وہ کامل ہے۔ محیط ہے۔ اجزائے عالمین میں ایک جُز بھی چھوٹا یا بڑا ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی آنکھوں سے اوجھل ہو یا اس کے علم سے الگ ہو۔ یہ تمام جُزئیات پیدا ہونے سے پہلے بھی اللہ کے علم میں موجود تھیں۔ اب بھی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ ایک چیونٹی کے دل کی دھڑکن بھی سُنتا ہے۔

کچھ علم آپ کو بخش دیا گیا ہے۔ آپ فقہ جانتے ہیں یا تفسیر جانتے ہیں یا قرآن مجید جانتے ہیں۔ قرآن مجید تو اللہ کا کلام ہے۔ آپ کہاں اس کے عالم بن بیٹھے۔ علم خداوندی کا عالم بننا کوئی آسان بات ہے۔ ایک شخص قرآن مجید پڑھ لیتا ہے۔ وہ علمِ غیب ہے۔ خدا کی طرف سے آیا ہوا علم ہے جس کو وہ پڑھ رہا ہے۔ وہ علم غیب کا عالم ہے۔ اس واسطے شریعت میں اس کو عالم کہتے ہیں لیکن اس کو

عالم کُل نہیں کہہ سکتے۔ اس کو عالم کتاب کہہ سکتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ ایک شخص علم پڑھ جاتا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ فاضلوں کا فاضل ہے۔ مثال کے طور پر آپ کے شہر میں وکیل موجود ہیں۔ حالانکہ وکیل اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ کوئی مقدمہ ہو تو آپ وکیل کے پاس جاتے ہیں۔ اس کو وکیل کہنے سے شرک لازم نہیں آتا۔ کیونکہ اللہ نے محدود طور پر اس کو علم وکالت دیا ہے۔ پھر وکیلوں میں ایک بڑا وکیل ہوتا ہے۔ عالموں میں ایک بڑا عالم ہوتا ہے، حکیموں میں ایک بڑا حکیم ہوتا ہے۔ طاقت وروں میں ایک بڑا طاقت ور ہوتا ہے۔ غنیوں میں ایک بڑا غنی ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے احکم الحاکمین فرما کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ دُنیا میں اور بھی حاکم ہوں گے لیکن ان کی بادشاہتیں عطائی ہوں گی۔

حاکم اللہ کی صفت ہے۔ جابر اللہ کی صفت ہے۔ قادر اللہ کی صفت ہے۔ اور اس میں کوئی دُوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ جس طرح وہ صفات اللہ کے پاس موجود ہیں لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ کسی کو عطا کرے۔ اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

اب علم غیب کی تعریف یوں ہوگی کہ جو انبیاءؑ کو عطا فرمایا گیا ہے۔ وُہ صفاتِ خداوندی کے اظہار کے لیے ہے۔ انبیاء کرام علیہم الصّلوٰۃ والتسلیم کو زمانہ بھر کے عالموں سے زیادہ علم دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید ناطق ہے حضرت آدم علیہ السّلام کے لیے:۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

حضرت آدم علیہ السّلام ایک لاکھ کئی ہزار انبیاءؑ کا بالنبوّت ایک جزو تھے! ایک

لاکھ کئی ہزار انبیاء مل کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنے۔ وہ نبیوں کا کُل بنتے ہیں یعنی سارے انبیاءؑ کو ملا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی بنتی ہے اب ایک جزو نبوّت کو اتنا علم بخشا جاتا ہے کہ اس کی وسعتوں، پہنائیوں اور گہرائیوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

ارشادِ باری ہوتا ہے وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ سب لوگ اس بات کو جانتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جس کا نام نہ ہو۔ لوحِ محفوظ میں جو نام لکھے ہوئے ہیں وہ ہجّوں میں ہیں۔ ہجّوں سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ وہاں بھی الف ب سے کام لیا گیا ہے۔ الف ہجی ہے اور اس کا اسم الف ہے۔ ب ہجی ہے اور اس کا اسم ب ہے۔ ت ہجی ہے اور اس کا اسم ت ہے۔ اس طرح ہجّوں کے نام ہیں۔

اگر لوحِ محفوظ میں ہجّوں سے فقرے ترتیب دیے گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب کے سب اسماء ہیں۔ وہ ہجّے بھی وہ کلمے بھی اسماء ہیں۔ وہ آیات بھی اسماء ہیں۔ سارے کا سارا مضمون اسم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نام خود اسم ہے۔ ذاتی اسم اللہ ہے اور اس کے بہت سے صفاتی نام ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ ہر وہ چیز جو واقع ہو چکی ہے۔ اس کا نام رکھ دیا گیا ہے۔ اور ان سب کا علم حضرت آدم علیہ السلام کو بخش دیا گیا۔ عدم اسم ہے۔ شہود اسم ہے۔ غیوب اسم ہے۔ جب یہ علم تقسیم کیا گیا، تو فرشتوں نے ان سے کچھ بات کی۔ جب ان کو دو بدو کیا گیا اور فرمایا گیا کہ وہی مضمون میں تمہارے سامنے رکھتا ہوں جو آدم علیہ السلام کے سامنے رکھا تھا تم مجھے جواب دو

فرشتوں نے تعجب میں مبتلا ہو کر کہا: قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَا۔ سب بزرگیاں تیرے لیے ہیں ہم کچھ نہیں جانتے۔ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا یہاں نفی علم نہیں کی گئی بلکہ کہا گیا ہے۔ علم ہمارے پاس ہے مگر اتنا ہے جس قدر تو نے ہمیں عطا کیا ہے

اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ

لیکن اتنا علم جتنا تو نے ہمیں عطا کیا ہے۔ وہ علم کامل کا اختصاص خدا پر کرتے ہیں اور اس کا اقرار کرتے ہیں کہ حضرت آدم صفی اللہ کو ہم سے زیادہ علم بخشا گیا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام جو آخری نبوّت کے یا النبوّت ایک جزو ہیں اور تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ایک لاکھ کئی ہزار پیغمبروں کی صفات سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بنتی ہے۔ اگر نبوّت کے ایک جزو کے پاس اتنا علم ہے تو خاتم النبیّین کے علم کے بارے میں کیا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ یاد رکھنا سارے نبیؑ عطائی علم رکھتے تھے۔ یہاں نبوّت کے علم کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ اگر آپ سورۃ کہف پڑھیں تو آپ کو ولایت کے علم کی بھی خبر ہو جائے گی۔

انبیاءؑ کا علم بالوحی ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے یا خواہشات نفسانی کے مطابق کوئی بات نہیں کہتے بلکہ وہی بات کہتے ہیں جو پروردگارِ عالم ان کو بتاتا ہے۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نطق مبارک اور اس کا ایک ایک لفظ سب کا سب اللہ کا ارشاد تھا اور اسے حدیث کہا جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے جو کچھ ارشاد فرمایا۔ وہ حدیث پاک ہے۔ اس واسطے

حدیث سے انکار نہیں ہو سکتا اور حدیث پاک قرآن مجید کو سمجھنے کا معیار ہے اور اس کے بغیر قرآن مجید کو سمجھا نہیں جا سکتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے پہلے مفسّر ہیں۔ سُورتیں اُتر رہی تھیں آیات نازل ہو رہی تھیں لیکن آیاتِ پاک کا کوئی ترجمہ نہیں جانتا تھا۔ سب سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کا ترجمہ فرمایا۔

جو لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں وہ اقتدار کا انکار کرتے ہیں۔ اگر آیات اُتر رہی تھیں اور ان کا ترجمہ کرنے والا کوئی نہ تھا تو آخر صحابہؓ نے کس طرح انہیں سمجھا معلوم ہوا کہ سب سے پہلے مفسّر حضرت رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے جو ترجمہ وہ بیان فرما رہے تھے وہ حدیث شریف تھی۔ وہ کوئی اپنی مرضی سے نہیں کہتے تھے بلکہ وہی کہتے تھے جو ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ علم کا دعویٰ کیا۔ حکم ہوتا ہے کہ بحرین کی طرف جایئے اور اپنے ساتھ مچھلی بھُون کر رکھ لیجیے۔ اور اپنے بھائی کو بھی اپنے ساتھ لے لیجیے۔ آپ بھُونی ہوئی مچھلی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور اس مقام پر پہنچتے ہیں جہاں بتایا گیا تھا۔ وہاں ایک بندۂ خدا آپ کو ملتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا مضمون ہے جو نصِ قرآن ہے۔

شاید ترجمہ میں الفاظ آگے پیچھے ہو جائیں لیکن مضمون بالکل وُہی ہے۔ حکم ہوا تھا کہ آپ جائیں وہاں ایک بندہ ملے گا۔ اس کے ساتھ بیٹھیں، مجلس کریں۔ چنانچہ آپ اس بندۂ خدا سے بحرین میں ملتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ نبیٔ وقت ہیں لیکن اس کے باوجود کہا کہ شاید آپ میرے ساتھ نہ رہ

سکیں گے۔ لیکن آپ نے وعدہ فرمایا کہ میں انشاء اللہ استقامت سے رہوں گا اور صبر کروں گا۔

چنانچہ آپ ان کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک کشتی آئی جس کو آپ نے توڑ دیا۔ کشتی سامانِ سبیل ہے۔ شریعت میں حکم ہے کہ راستہ نہ توڑا جائے۔ کیونکہ مسافروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ جملہ شرائع میں راستہ بنانے کا حکم ہے۔ توڑنے کا حکم نہیں ہے۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے پوچھا۔ راستہ کیوں توڑا؟ مسافر اس سے گزرتے ہیں۔ فرمایا:

قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا۔ میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے۔ آپ نے کہا۔ انشاء اللہ اَئندہ میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ پھر آپ آگے گئے۔ راستے میں ایک نابالغ بچہ ملا۔ آپ نے اس کے ایک ایسا طمانچہ مارا کہ وہ مر گیا۔

کسی بھی شریعت میں قتل جائز نہیں ہے۔ اللہ کے پاس جتنے نبیؑ آئے ان کی شریعتوں میں کہیں بھی یہ روا نہیں ہے کہ کسی کو بلا وجہ قتل کریں۔ چنانچہ موسےٰ علیہ السّلام نے شرعی طور پر احتساب کیا۔ یہ غیر شرعی احتساب نہیں تھا۔ شرعاً کسی شخص کو بلا وجہ قتل کرنا حرام ہے۔ اے مردِ خدا! تم نے کیوں اس بچے کو قتل کیا؟ آپ نے فرمایا: میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے؟

آپ نے دوسری دفعہ وعدہ کیا اور وہ آگے چل پڑے۔ انہیں ایک شکستہ مکان نظر آیا۔ انہوں نے کہا کہ اے موسےٰ۔ آپ بھی پتھر لائیں اور میں بھی کوشش کرتا ہوں۔ ہم دونوں مل کر اس کی تعمیر کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس کی دیوار کو تعمیر کرنا شروع کر

دیا - آپ نے پھر اعتراض کیا کہ بلا اجازت، بلا معاوضہ اس دیوار کو کیوں تعمیر کر رہے ہیں - اس پر آپ نے فرمایا:

آپ نے تین دفعہ پیہم و مسلسل مجھ پر اعتراضات کیے - اس لیے میرے اور آپ کے درمیان جُدائی ہو گئی - آپ جاتے ہوئے سُنتے جائیں کہ میں نے یہ تینوں عمل کیوں کیے حالانکہ یہ کہنے والا نبی نہیں ولی تھا - حدیث میں آیا ہے اور تمام علماء نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ خضر علیہ السلام تھے اور خضر علیہ السلام ولی اللہ ہیں - ختم نبوت کے بعد کوئی ذی حیات انسان اس دنیا میں نبی نہیں ہو سکتا - خضر علیہ السلام تا قیامت زندہ رہنے والے ہیں - اس لیے وہ ولی اللہ ہیں -

پھر انہوں نے فرمایا تھا کہ میں نے وہ کشتی اس لیے توڑی تھی کہ وہاں کا بادشاہ مسافروں کو اذیت پہنچاتا تھا اور ان سے بیگار لیتا تھا - بچے کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک صالح باپ کا بیٹا تھا - اس کا باپ حاضر نہ تھا اور یہ بچہ آئندہ ایک بڑا مشرک ہونے والا تھا - میں نے اسے اس واسطے قتل کیا ہے کہ آئندہ اس سے شرک اور کفر نہ پھیلے - حالانکہ شرک کے محض امکان سے کسی کا قتل کرنا شریعت میں جائز نہیں ہے -

دیوار کے بارے میں فرمایا کہ یہ ایک یتیم کی میراث ہے اور اس کے اندر خزانہ پوشیدہ تھا - جس کو میں نے کشف سے دیکھا تھا - اس دیوار کو بلا اجازت بلا معاوضہ تعمیر کرنے کی غرض یہ تھی کہ اس یتیم کا حق محفوظ رہے -

آج اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں بادشاہ ہوں لہٰذا ولی اللہ پر اعتراض کرتا ہوں کہ وہ علم غیب کی باتیں کیوں کرتے ہیں تو وہ حق بجانب نہ ہوگا - جب کہ نبیؑ وقت

ایک ولیُ اللہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر اعتراض نہیں کرتا، بلکہ خاموش ہو جاتا ہے۔ حالانکہ نبیوںؑ کو دوسروں پر احتساب کرنے کے بعد یہ حکم نہیں ہے کہ اسے توڑیں۔ آج تک کسی نبیؑ نے احتساب کو نہیں توڑا۔ لیکن قرآن مجید سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام کے لیے اپنا احتساب توڑ دیا تھا۔

احتساب کے متعلق مزید وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ آپ کے پاس تین روٹیاں تھیں راستے میں ایک روٹی کسی نے کھالی۔ آپ جانتے تھے کہ کس نے کھائی ہے لیکن آپ اس مقام پر علم غیب اختیار نہیں کرتے بلکہ دلائل سے کام لیتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کس نے روٹی کھائی تھی۔ وہ خیال فرماتے ہیں کہ اگر اس شخص کو میں پکڑ نہ سکا تو بڑے بڑے احتساب کس طرح کروں گا۔ آپؑ نے یہاں معجزات پیش کیے۔ اور جنگل کے درندوں کو پکار کر کہا کہ میں اللہ کا نبیؑ ہوں۔ میرے پاس آؤ۔ وہ آگئے تو آپؑ نے فرمایا: دیکھو ساتھیو! جنگل کے درندے بھی میرا حکم مانتے ہیں تم بھی میرا حکم مانو اور بتاؤ کہ وہ ایک روٹی کس نے کھاتی ہے؛ ہم تین آدمی ہیں۔ یا میں نے کھائی ہے یا تم دونوں میں سے کسی نے کھائی ہے۔ پھر بھی دونوں نے انکار کیا۔ انسان بضد ہو جائے تو خدا تعالیٰ ہی اس کو ہدایت دے سکتا ہے۔ پھر آگے چلے اور ایک دریا کو بغیر کشتی کے عبور کیا اور کہا کہ دیکھو دریا بھی میرا احترام کرتا ہے تم بھی خیال کرو۔ اور بتاؤ کہ روٹی کس نے کھائی ہے۔ ان کا جواب پھر بھی نفی میں تھا۔ اللہ نے ان کو الہام کیا کہ یہ دُنیا دار ہیں نفس پرست ہیں لالچی اور حریص ہیں۔ ان کے سامنے کوئی ایسا معجزہ پیش کیجیے جو ان کے مطابق ہو۔ پھر آپ نے تین اینٹیں لیں اور ان پر پھونکا تو وہ

سونا بن گئیں۔

اب آپؑ نے کہا کہ جس نے روٹی کھائی ہے اگر وہ اقرار کرے تو میں یہ تینوں اینٹیں اسے دے دوں گا۔ جس شخص نے روٹی کھائی تھی اس نے فوراً اقرار کرلیا اور آپ کا احتساب پورا ہوگیا۔ جب کہ بالمعجزہ دلائل کے ساتھ منوانے کی پیہم اور مسلسل کوشش کی گئی۔ ادھر موسےٰ علیہ السّلام نے عین ان مقامات پر جو شرعی رُو سے جُرم قرار دیے جاسکتے تھے۔ احتساب کیا کہ راستہ کیوں توڑا۔ بچّے کو قتل کیوں کیا۔ اور دیوار بلا اجازت کیوں تعمیر کی۔

ہر چند کہ تینوں احتساب شرعی تھے لیکن آپؑ نے جواب سُنا تو خاموش ہوگئے۔ اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ اولیائے عظّام کے سامنے دلیل نہ پیش کیجئے اور علمائے کرام کے سامنے حجّت نہ کیجئے کہ اولیائے عظّام جو علم رکھتے ہیں وہ تم نہیں رکھتے۔ اور علمائے کرام جو علم رکھتے ہیں وہ تم نہیں رکھتے۔

موسیٰ علیہ السّلام واپس آئے اور اپنی قوم کے سامنے اقرار کیا کہ اللہ کا علم بہت بڑا اور اتنا وسیع ہے کہ اسے کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ یہاں ایک اہم مسئلہ بیان کرنا ضروری ہے کہ خضر علیہ السّلام کسی طرح بھی نبوّت پر تفوّق نہیں رکھتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے خود حضرت مُوسیٰ علیہ السلام کو مزید علم سے واقف کرانا چاہا تو اس طرف بھیج دیا۔ نبیوں کو وحی کے ساتھ پابند کیا گیا ہے لیکن ولیوں پر وحی نہیں آتی، انہیں القا ہوتا ہے، الہام ہوتا ہے۔

اس واسطے نبیوں کے پاس بھی علم موجود تھا۔ حضور نبیٔ آخر الزّماں صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بعد سب سے بڑے عالم ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ کے بعد سب سے

بڑی عالم شہود و غیوب حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ذاتِ گرامی ہے اس کے بعد انبیاءؑ اور اولیاء ہیں۔ اولیاء کشف بیان کرتے ہیں۔ کشف کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

تمام علمائے کرام کا فیصلہ ہے کہ کشف کے معنی بھی کھلنے کے ہیں اور سب اس پر متفق ہیں کہ ترجمے کے معنی بھی کھلنے کے ہیں اور تفسیر کے معنی بھی کھلنے کے بیان کیے جاتے ہیں جب کبھی ایک عالم ایک مفکر اور ایک سائنس دان یا ایک حکیم ایک بوٹی کو دیکھتا ہے تو کیا یہ بوٹی کہتی ہے کہ میرے اندر ایسی خاصیت موجود ہے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی بوٹی نے حکیم سے خود بات کی ہو کہ میرے اندر ایسی خصوصیات موجود ہیں۔ حکیم کی فکر اس میں غور کرتی ہے اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں اور اس کی بصیرت اس کو حل کرتی ہے لیکن کوئی شخص آج تک یہ ثابت نہ کر سکا کہ بوٹی کے اندرونی خواص کو یہ آنکھ دیکھ سکتی ہے۔

لفظ کو عالم کی آنکھ دیکھتی ہے۔ معنی کو اس کی بصیرت دیکھتی ہے اور سب اس بصیرت کے قائل ہیں اور اس کا بھی سب کو علم ہے کہ بصیرت کسی کی پیشانی پر نہیں ہوتی بلکہ اندر ہوتی ہے۔ اب اگر اس پر اتفاق ہے کہ آنکھ صورت کو اور بصیرت معنی کو دیکھتی ہے تو کشف کا انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ سارا عالم کشف کرتا ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو کشف نہیں کرتا۔ جس نے زندگی میں کسی بات کا ترجمہ کیا ہو۔ اس نے کشف کیا ہے۔

بصارت آیت کو پڑھتی ہے۔ بصیرت آیت کو ترجمہ کرتی ہے پھر ترجمے کا بھی ترجمہ بھی اگر کیا جاتا ہے تو اس کو بھی بصارت نہیں بلکہ بصیرت ہی کرتی ہے جب تشریح کی جاتی ہے تو وہ بھی بصارت نہیں بصیرت کرتی ہے۔

یہ ساری باتیں بصیرت سے توجہ لے کر ظاہر ہو سکتی ہیں تو تکشف میں کیا

شبہ ہو سکتا ہے اور اگر ایک عالمِ دین کے قلم سے کشف ٹپک سکتا ہے تو ایک ولی اللہ کی آنکھ سے کیوں کر ٹپک نہیں سکتا؟

ہاتھ، جسم کے ثقیل اوزار ہیں اور اِس کا خارجی سامان ہے۔ آنکھ اس سے زیادہ لطیف ہے۔ آنکھ بھی ایک ہاتھ ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مدرکات کے ساتھ آنکھ بھی تعلق رکھتی ہے۔ درک کرتی ہے اور کسی چیز کو پکڑ کر اندر لے جاتی ہے تو اس پر ہاتھ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ سماع بھی عالمِ مدرکات سے کھیلتی ہے اور باہر کی چیزوں کو اندر لے جاتی ہے۔ لہٰذا سمع بھی ایک ہاتھ ہے۔

اگرچہ اس ہاتھ کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قوتِ شامہ ایک ہاتھ ہے جو ہر قسم کی خوشبو اندر لے جاتی ہے، مگر نظر نہیں آتی۔ لامسہ بھی محسوس کی جاتی ہے۔ دیکھی نہیں جا سکتی۔ یہ سب ہاتھ ہیں۔ قوائے ظاہرہ کی طرح جستجو کرتے ہیں۔ چیزوں کو محسوس کرتے ہیں اور اندر لے جاتے ہیں اس واسطے آنکھ ایک ہاتھ ہے مگر لطیف۔

اگر ارادت ہاتھوں سے ٹپک کر مضمون بن سکتی ہے۔ اگر ارادت ہاتھوں سے ٹپک کر طیارہ بنتی اور ہوا میں اُڑ سکتی ہے۔ اگر ارادت انسانی ہاتھوں سے ٹپک کر جوہری توانائی بن سکتی ہے تو کیا ایک ولی اللہ کا تصوّر، ایک ولی اللہ کی تمنا، کشف بن کر آنکھوں سے باہر نہیں آسکتی۔ اس سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے۔ اس سے انکار کرنا فطرت کے اصولوں سے انکار کرنا ہوگا۔

اگر خدا علم نہ دیتا تو معلومات کے متعلق حکم دینا بے فائدہ ہوتا۔ علمِ معلومات

سے تعلق رکھتا ہے۔ معلومات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ صوری اور معنوی۔ اللہ کا منشاء درحقیقت معنویت تک پہنچانا ہے۔ ایسے حقیقی معنے تک جس سے تمام معانی نکلتے ہیں۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے صورہائے مختلفہ کو آنکھوں کے سامنے بکھیر دیا ہے اور معانی کی طرف دوڑنے کے لیے بصیرت دی ہے۔ کشف مومنوں کے گھر کی ایک لونڈی تھی لیکن بعد کے لوگوں نے اسے ایک اجنبی چیز بنا دیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم استخارہ کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ آپ کے حضور میں ایک عورت آتی ہے اور عرض کرتی ہے کہ میری بیٹیاں مر چکی ہیں۔ ایک بیٹی تھی وہ بھی فوت ہو چکی ہے۔ فرمایا۔ جاؤ استخارہ کرو۔ رات کو خواب میں ملے گی۔ اس نے استخارہ کیا اور لڑکی کو جنگل بیابان میں دیکھا۔ یہ حدیث شریف ہے کہ آتش جہنم میں مبتلا تھی۔ صبح شکایت کرتی ہے فرمایا کہ اس کے خاوند کو بلاؤ۔ شاید اس نے اپنے خاوند کی حق تلفی کی ہو۔ اس کا خاوند آیا۔ آپؐ نے پوچھا تو عرض کیا:

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اپنی بیوی سے بے حد راضی ہوں۔ فرمایا۔ اس کے وہ گناہ بھی معاف کرو۔ جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ میں نے معاف کیا۔ آپؐ نے اس عورت سے فرمایا۔ پھر استخارہ کرو۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ وہ جنت الفردوس میں موجود ہے۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی ہے لیکن وہ منہ پھیر لیتی ہے۔ وہ اس طرف جاتی ہے تو وہ دوسری طرف منہ موڑ لیتی ہے۔ آخر وہ بیٹی سے شکایت کرتی ہے کہ میں تیری ماں ہوں۔ مجھ سے ملو اور بات کرو کہ کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے روٹھی ہو۔ اُس نے

جواب دیا:

کہ تم ماں ہونے کی حق دار نہیں ہو، تم ظالم اور ناانصاف ہو۔ فانی دُنیا میں، ایک مستعار دُنیا میں تم نے مجھ سے اس قدر لاڈ پیار کیا، لیکن خدا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کبھی تم نے یہ نہیں کہا کہ نماز نہ پڑھنے والوں سے اللہ بے حد ناراض ہوتا ہے اور غضب کی سزا بیان کرتا ہے۔ میں نے اپنے خاوند کی حق تلفیاں تیرے سامنے کیں۔ لیکن تُو نے نہ سمجھایا اور فلاں فلاں گناہ کیے، لیکن تُو نے نہ بتایا، اس واسطے تو میری ماں نہیں میری دُشمن ہے۔ ماں تو وہ ہونے کی حق دار ہے جو اللہ کے خوف سے ڈرائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھوٹی چھوٹی باتوں تک کا حکم دیتے تھے کہ ان کے لیے استخارہ کرو۔ احادیث میں استخارے کے متعلق بالوضاحت بیان آیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں عزیزِ مصر نے جو غیر مُسلِم تھا۔ ایک خواب دیکھا تھا۔ قرآن شریف اس خواب کو بیان فرماتا ہے۔ اگر خواب اتنی سنجیدہ چیز ہے اور ایک غیر مسلم ایک نبیؑ اللہ سے اپنے خواب کی تعبیر وصُول کرتا ہے اور وہ تعبیر ٹھیک نکلتی ہے تو کیا ایک کلمہ شریف پڑھنے والا سچّے خواب نہیں دیکھ سکتا؟ اسی لیے باوضُو لیٹنے کا حکم ہے۔

باوضُو سونے والے، بے وضُو سونے والوں سے مقدّم ہیں۔ اچھّے اور نیک ہیں۔ نیکی اختیار کرو۔ خدا اور اس کے رسُولؐ کا خوف اپنے دِل میں رکھو۔ تحقیق کرو۔ مسلمان محقق ہے۔ مبحث نہیں ہے۔ بے جا بحث میں زندگی برباد کرنے والا نہیں ہے، بلکہ وہ تحقیق کرتا ہے اور جب تک کسی بات کی تحقیق نہ کرلے۔ اس پر

بحث نہیں کرتا اور اگر بحث کرے تو اس کا مقصد کسی حقیقت تک پہنچنا ہوتا ہے۔ بعد کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو بے جا بحث میں مبتلا کر کے تحقیق کرنا چھوڑ دیا ہے۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اسلام رُوحانی مذہب نہ ہوتا تو وہ غیر مقبول ہوتا۔ اسلام ہی ایک ایسا رُوحانی مذہب ہے جو رُوح سے ابتداء کر کے مادّے پر مسلط ہوتا ہے اور دونوں جہانوں کو مسخر کر لیتا ہے۔

قرآن مجید اور قضا و قدر

فطرت نیکی اور بدی کرنے میں کسی کا ہاتھ نہیں روکتی
البتہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا دیتی ہے
انسان کو یہ گلہ نہیں کرنا چاہیے کہ قسمت نہیں بدل سکتی
بلکہ نیک ہو کر اللہ کی
تائید سے قسمت کو بدل لینا چاہیے جس سے ایک جہان
کی قسمت بدل سکتی ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتٰبِ

اس آیت کریمہ سے پہلے تمہیداً کچھ تحریر کرنا ضروری ہے۔ لوگوں کو جاننا چاہیے کہ یہ سارا عالم موجودات، یہ ساری کائنات اور اس میں جو کچھ بھی ہے۔ وہ لوحِ محفوظ میں موجود ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تمام اشیائے عالمین لوحِ محفوظ سے پہلے بھی خداوندِ ذوالجلال کے علم میں موجود تھیں اور جو آئندہ وجود میں آئیں گی وہ بھی اللہ پاک کے علم میں موجود ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں لوحِ محفوظ ایک کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کا ذکر فرمایا ہے۔ ان کی پیدائش و مرگ ان کے مختلف حالات، ان کے تغیرات اور ان کے ازل سے لے کر ابد تک کی کیفیات نہایت شرح و بسط سے درج فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پہلے اپنے علم، اپنی قدرت، اور اپنے فیصلے سے پیدا فرمایا۔ اور اپنی ہی مرضی سے انہیں خصوصیات بخشی ہیں۔ کوئی چیز اس کے حکم اور مرضی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور نہ حرکت کر سکتی ہے یہاں تک کہ:

لَا يَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ تَعَالٰى

ایک ذرّہ بھی اللہ کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا۔ فرمایا:

مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

"یعنی تم کچھ بھی پسند نہیں کر سکتے جب تک اللہ اسے پسند نہ کرے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دُنیا میں جو گناہ ہوتے ہیں اور ہم سے جو خطائیں سرزد ہوتی ہیں کیا ہم اس کے ذمہ دار گردانے جا سکتے ہیں؟ اکثر اس پر بحث ہوتی رہتی ہے اور زیادہ تر اہلِ عقل اس مسئلہ میں اُلجھے ہوئے ہیں بالخصوص دورِ حاضرہ کے لوگ اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ غالباً ان کے سامنے اس مسئلے کا صحیح حل نہیں پیش کیا گیا۔ اس واسطے ان کا شک جاری ہے۔ خدا کرے اس مضمون میں اِس کا صحیح حل پیش کیا جا سکے۔

اہلِ اللہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو سب سے پہلے تخلیق فرمایا ہے۔ وہ احساس تھا۔ قرآن مجید اور احادیثِ قدسیہ سے استنباط کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اہلِ اللہ نے یہ فیصلہ شریعت کی روشنی میں فرمایا ہے۔ یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے احساس تخلیق فرمایا۔ یہ ارواح تھیں۔ ارواح سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضور فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے نور کو پیدا فرمایا لیکن یہ تخلیقِ کائنات کا نقطۂ آغاز تھا۔ اور یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ازل کے دِن اللہ تعالیٰ نے جن احساسات کو خطاب فرمایا۔ وہ رُوحیں تھیں۔ وہاں انبیاء، صلحا، شہداء اور عامۃ الناس کی ارواح موجود تھیں۔

اہلِ اللہ نے فرمایا کہ تمام رُوحیں احساسات کے ساتھ موجود تھیں۔ اور ادراک رکھنے والی اور فہم رسا رکھنے والی تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رُوحوں کو استفہام کے ساتھ خطاب فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہُوں۔ جیسے کوئی یُوں کہے کہ آپ فلاں طرف سے نہیں آئے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ

یقیناً اس طرف سے ہی آئے ہیں اور آپ کو اس کا علم ہے اسی لیے آپ سے پوچھا جا رہا ہے کہ آپ اس طرف سے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی استفہام سے کام لیتے ہوئے فرمایا ہے: اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ۔ اس کلامِ الٰہی سے معلوم ہوا کہ فہم پہلے موجود تھا۔ اگر فہم اور شعور موجود نہ ہوتے تو استفہام غیر ضروری ہوتا۔ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں"۔ یعنی تم جانتے ہو کہ میں تمہارا رب ہوں اور تم کو اس کا علم ہے۔ سب رُوحوں نے جواب دیا۔ "بلیٰ" ہاں تو ہمارا ربّ ہے۔ اگر پہلے احساس نہ ہوتا اور امرِ الٰہی نازل ہو جاتا تو ایسی حالت میں کوئی مکلّف نہ ہوتا۔ پہلے احساس کی سرزمین کو پیدا فرمایا۔ اس کے بعد امرِ الٰہی صادر ہوا۔ اس واسطے فرمایا کہ تم تکلّف میں مبتلا کر دیے گئے ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا فیصلہ تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے مخلوق کو پیدا فرمایا۔ کسی عقل و فراست یا علم و ہنر کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے مخلوقات کو پیدا فرما کر اس کو نفع اور ضرر کا احساس بخشا۔ اس کے بعد امرِ الٰہی صادر ہوا۔

اس واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے علم سے فرشتوں، جنوں اور انسانوں کی رُوحوں کو جسمانی اشتراک کے ساتھ پیدا فرمایا اور عقل و شعور کی نعمت کے ساتھ انہیں جاری و ساری کر دیا۔ اس کے بعد بعثتِ نبوّت کے ساتھ ذوی العقول انسانوں اور جنوں کو اپنے اوامر و نواہی صادر فرماتا رہا۔ اس بنا پر ذوی العقول مکلّف قرار دیے گئے۔

یہ خاص بات ہے کہ اللہ کے جملہ اوامر و نواہی سب کے سب ہمارے نفع کے لیے ہیں۔ نقصان کے لیے نہیں۔ حضرت آدم علیہ السّلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ و اصحابہٖ وسلم تک جس قدر اوامرِ سماویہ نازل ہوئے۔ وُہ من حیث المجموع انسانی فلاح و

بہبود کے لیے تھے۔ اللہ کے اوامر مضرّت سے پاک ہیں۔ جن امُور سے ہمیں مکلّف کیا گیا۔ ان میں دِین و دُنیا کے مفاد مضمر ہیں اور جن امُور سے منع فرمایا گیا ہے ان کو چھوڑنے میں بھی ہمارا ہی فائدہ ہے۔

احساس و شعور اور اوامر و نواہی ہمارے ہی منافع کے لیے ہم کو دیے گئے ہیں۔ ہم میں کوئی ایسا انسان نہیں ہے جس کے ہاتھ میں زہر دیا جاتے اور وہ اس کو زہر جانتے ہوئے کھالے۔ سوائے اس گستاخ کے جو خودکشی کرنا چاہتا ہو۔ اس کے علاوہ کوئی باشعور انسان ایسا نہیں ہے جو دانستہ اپنے آپ کو خلاف حُکمِ الہٰی ہلاکت میں ڈالے۔ بلکہ کوئی منکرِ حق بھی اس فطری حُکم خداوندی کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک سب انسان اپنے منافع کے لیے دوڑتے نظر آتے ہیں اور اپنے علم و فن اور محنت و عقل کو اسی لیے خرچ کرتے ہیں۔ ان میں چھوٹے بڑے، امیر، غریب، عالم اور جاہل کی تخصیص نہیں ہے۔ برخلاف اس کے جہاں نقصان کا اندیشہ ہو۔ اس طرف قدم نہیں اُٹھاتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان قطعی نفع چاہتا ہے۔ اور کسی حالت میں نقصان نہیں چاہتا اور مہلکات سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہے۔

جب انسان کے اندر اس درجہ شعُور موجود ہے کہ وہ سُود و زیاں میں تمیز کرسکتا ہے تو پھر وہ اپنے اعمال کا ذمّے دار بھی ہوگا۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس کو احساس و شعُور دے کر چھوڑ نہیں دیا گیا۔ اس کی تعلیم و ہدایت کے لیے انبیائے کرام علیہ الصّلوٰۃ والتسلیمات مسلسل بھیجے جاتے رہے۔ صحائفِ آسمانی اُترتے رہے۔

اور آیات نازل ہوتی رہیں۔ نفع اور ضرر کی تمیز کرائی جاتی رہی ۔ چنانچہ فرمایا :-

مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ط

جس شخص نے احساس اور شعور کی موجودگی میں اللہ اور اس کے رسُولوں کو تسلیم کیا اور ان کی اطاعت کی وہی عظیم کامیابی تک پہنچا۔ اس کے خلاف جانے والے صریح گمراہی اور خسارہ میں ہیں۔ درحقیقت ان کی دنیاوی ترقیاں اور کامیابیاں بھی ان کے لیے سُودمند نہ ہوں گی ۔

قضا و قدر کے بارے میں قرآنِ حکیم میں اور فیصلوں کے علاوہ ایک آیۃ کریمہ یہ بھی ہے :

يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ط

ہر مسجد میں، ہر منبر پر اس کی یہی تفسیر ہوتی ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔ اکثر لوگ اس کی پوری تفسیر بیان نہیں کرتے یہ اہلِ اللہ ہی کا کام ہے کہ اس کی پوری پوری تفسیر کریں۔ اس واسطے کہ اہلِ عقل بھٹک سکتے ہیں ۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی سرزمینوں میں اگر کوئی گناہ کرے تو کیا وہ اس کا ذمہ دار ہے ؟ کیا اس کی نیکیوں اور بدیوں کی جزا و سزا ملے گی ؟ کیا اللہ تعالیٰ کسی کو گناہوں سے روک سکتا ہے ؟ درحقیقت يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ میں يَّشَآءُ کی قید رکھی گئی ہے ۔ یعنی اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے ۔ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ۔ اس مقام پر یہ امر پھر غور طلب ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ گناہ کو پسند کرتا ہے ؟ سارے قرآنِ کریم اور

احادیثِ قدسیہ میں کہیں بھی یہ فیصلہ نہیں ملتا۔ کہ اللہ تعالیٰ گناہ کو پسند کرتا ہے۔ تمام آسمانی کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کو پسند کرتا ہے اور اسی کے کرنے کا حکم فرماتا ہے اور بُرائی سے منع فرماتا ہے اور شیطان جو نیکی کی ضد ہے بُرائی کی دعوت دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً ط

یعنی شیطان تم کو مذلت اور گمراہی کا رستہ بتاتا ہے اور فسق و فجور میں مبتلا کرتا ہے۔ اور ہلاکتوں کی طرف ہانکتا ہے اور خداوندِ ذوالجلال تمہیں مغفرت کی دعوت دیتا ہے۔ جس میں خود تمہاری عافیت ہے۔

یہاں قید "یشاء" سے معلوم ہوا کہ اللہ صرف نیکیوں کو پسند کرتا ہے۔ ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ نیکیوں کو ہی پسند فرماتا ہے تو پھر لوگ کیوں گمراہ ہوتے ہیں؟۔ سورۃ بقرہ میں منافقین کے ذکر میں فرمایا:۔

وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ط

یعنی ان کو اللہ ان کی گمراہی میں دھکیل دیتا ہے۔ ایسے کذابوں اور فریبیوں کے ساتھ اللہ کیا کرتے ہیں۔ ان کو ان کے گناہوں اور سرکشیوں میں جھونک دیا جاتا ہے اور یہی ان کی سزا ہے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ جو جس چیز کو پسند کرے وہ اسے ملے۔ پہلے تو وہ گناہ سے منع فرماتا ہے۔ اس کے سارے رسُولؑ گناہ سے منع کرتے ہیں۔ اس پر براہین نازل کیے جاتے ہیں۔ زلزلے ڈالے جاتے ہیں۔ طوفان اور آندھیاں چلائی جاتی ہیں۔ بلائیں اور وبائیں بھیجی جاتی ہیں۔ اگر گناہ گار اس سے باز نہ آئیں تو ان کو ہلاکت میں ڈال دیا جاتا ہے۔

تاریخِ انسانیت میں ایسے لوگوں کے بے شمار عبرتناک واقعات موجود ہیں۔ چنانچہ فرعون کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کو ساری زندگی دردِ سر نہ ہوا۔ اللہ کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ دردِ سر میں مجبور ہو کر اللہ کو پکار بیٹھے۔ اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض تھا اور یہی اس کی سزا تھی کہ اس کو اس کی فرعونیت ہی میں تباہ کر دیا۔ اس کی سرگرداں سرکشی خود اس کی تباہی کا سامان بن گئی۔

قانونِ فطرت یہ ہے کہ جو گناہوں کو پسند کرتے ہیں۔ ان کو اسی میں مبتلا رکھا جاتا ہے اور جو نیکیوں کو پسند کرتے ہیں ان کو نیکیوں کی توفیق دی جاتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط

یعنی ایمان لانے کے بعد اسی ایمان کے اندر جو زندگی بسر کرتے ہیں۔ اللہ ایسوں کو اپنا دوست رکھتا ہے۔ ان پر اپنے اسرار و رموز منکشف فرماتا ہے۔ اس دوستی کے نتیجہ میں لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہدایت کا سمجھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ہدایت اپنے اندر بڑا عمق رکھتی ہے جو انسان پر فوراً واضح نہیں ہو سکتی، مگر جن کو اللہ اپنا دوست رکھتا ہے۔ ان پر اپنے اسرار و بھید آہستہ آہستہ منکشف فرماتا ہے:

يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط

کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جہالت کی تاریکیوں، کفر و شرک اور بدعت کی ظلمتوں سے نکال کر وہ نورِ اسلام کی طرف لے جاتا ہے۔ ہدایت کے راستے ان پر واضح ہوتے ہیں اور عقدہ ہائے لاینحل ان پر کھلنے لگتے ہیں۔ ان کے لیے اسباب

پیدا کر دیے جاتے ہیں۔ کسی بندۂ خدا کو ان کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ کوئی مفسر کوئی مفکر، کوئی معلّم ان کو مل جاتا ہے اور وہ ہدایت پا جاتے ہیں۔ بہر حال اللہ کی تائید ان کے شاملِ حال ہوتی ہے۔

برخلاف اس کے جو لوگ منکر ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولوں ؑ کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ ان کو سزا دیتا ہے۔ وہ اسی سرزمین پر بستے اور روزی کماتے ہیں شمس و قمر ان پر طلوع ہوتے رہتے ہیں۔ زندگانی کے سارے فوائد و منافع وہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اللہ ان کو یہ سزا دیتے ہیں کہ ان کو اپنی دوستی سے محروم کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ رب العالمین ہے اور اس نے سب کو روزی دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ وہ سب کو پالنے والا ہے۔ اس لیے پروردگارِ عالم اپنے دسترخوانِ ربوبیت سے کسی کو نہیں اُٹھاتا۔ ان کو ساز و سامانِ زندگی، اہل و عیال، قصر و ایوان، دنیاوی جاہ و جلال تک بھی دیے جاتے ہیں لیکن اللہ ان کی بداعمالیوں پر بدستور ناراض رہتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَـھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ

جو لوگ منکرِ خدا ہیں۔ ان کے دوست شیطان ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کی عقلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ قابلِ فہم بات بھی سمجھ نہیں سکتے اور حق سے ضد کرنے لگتے ہیں۔ اپنی کج روی کو منطقی دلائل سے ثابت کرتے ہیں حالانکہ وہ ہمیشہ حق و صداقت سے دُور رہتے ہیں۔ انبیائے کرام نے ان کی تفہیم کے لیے عقلی دلائل اور خرقِ عادات یعنی معجزات پیش کیے، لیکن جو ضدی تھے۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔

ایک دفعہ ابوجہل نے ضد میں آکر اپنے رفقاء سے منصوبہ بنایا کہ ایک بڑے حکیم سے بر سرِ مجلس یہ کہلوایا جائے کہ حضور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم العیاذ باللہ مراقی ہیں - اور وہ جو باتیں کرتے ہیں صحیح نہیں ہیں- اس لیے آپ کو نبی نہ تسلیم کیا جائے -چنانچہ اکابر جمع ہوئے اور ایک یہودی حکیم کو دعوت دی گئی- ابوجہل اپنے رفقاء سے سازش کرتا ہے اور اس مجلس میں حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو بھی دعوت دی جاتی ہے۔

ابوجہل اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ کوئی بھی آپؐ کی تعظیم کے لیے نہ اٹھے ۔ چنانچہ جب آپ تشریف لائے تو تائیدِ ایزدی اور اعجازِ نبوّت سے مجبور ہو کر تمام مجلس غیرارادی طور پر کھڑی ہو جاتی ہے ۔ اس مجلس میں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے سوالات کیے گئے ۔ آپ نے ایسے معقول اور مدلل جواب ارشاد فرمائے کہ ساری مجلس مبہوت ہوگئی ۔ بے بس ہو کر اس یہودی حکیم نے کہا کہ آپ ہمیں ایک معجزہ دکھائیں کہ چاند آسمان پر دو ٹکڑے ہو جائے ۔ تب میں آپؐ کو اللہ کا نبیؐ تسلیم کروں گا اور اسلام قبول کروں گا ۔ تب آپؐ نے اللہ کے حضور یہ دعا فرمائی :-

" اے اللہ میں تیرا ہی فرستادہ ہوں اور تیری ہی طرف سے لوگوں کو دعوت دیتا ہوں ۔ یہ لوگ مجھ سے معجزہ طلب کرتے ہیں ۔ تیری قدرت کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو جائے

چنانچہ آپؐ نے اس دعا کے بعد اپنی انگشت سے اشارہ فرمایا جس سے چاند دو ٹکڑے ہوگیا ۔ لیکن اس اعجازِ شق القمر کے بعد بھی منکرین نے کہا کہ یہ جادو

ہے۔ اللہ نے ایسے ہی لوگوں کے لیے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ط

یعنی وہ منکرین جنہوں نے دیدہ دانستہ حق سے مُنہ پھیرا۔ آپ کا ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ وہ ایمان نہیں لاتے۔ وہ جان بوجھ کر ضد کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ان کو قائل نہیں کر سکتے تھے بلکہ اس عالم الغیب نے جس کے علم میں ان لوگوں کی بد اعمالیاں اور ان کا انجام ہے ان کو مختوم فرما دیا ہے۔ کیونکہ ایسے اعمال کا یہی نتیجہ ہونا تھا۔ اب وہ اپنے ہی اعمال کے نتیجے میں مختوم ہو گئے ہیں۔ ایسے دانستہ انکار کرنے والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے۔ کہ اللہ نے ان کے دلوں پر سمع و بصر پر ناراضگی کی مہر لگا دی ہے اور ان پر حجاب طاری کر دیا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں معجزہ کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کی ذات کو اس طرح بدل دیا جائے کہ اس پر عقلِ انسانی احاطہ نہ کر سکے اور عقل عاجز و حیران ہو کر اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ مثلاً سنگ ریزوں کو قوتِ گویائی بخشنا، چاند کو شق کر دینا، سُورج کو واپس لوٹا دینا۔ دریاؤں کا بول اُٹھنا، مُردوں کو زندہ کر دینا۔ اعجازِ نبوّت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ ذاتِ کفر کو اسلام سے بدل دیتا ہے۔ نبیوں کے معجزات اگر بہت کچھ بدل سکتے ہیں تو کیا وہ مختومِ ازل کے ختم نہیں توڑ سکتے؟ یقیناً توڑ سکتے ہیں۔ مگر اللہ و رسُولؐ اس بات کو پسند نہیں فرماتے کہ ایسے سرکشوں کو جو سرکشی پر تلے ہوئے ہوں۔ معاف فرمایا جائے۔ یہی ناراضگی ان کو ہدایت

پر نہیں آنے دیتی اور وہ گمراہی میں پڑے بھٹکتے ہیں۔ یہی ان کی سزا بن جاتی ہے۔

اگر شعور و علم کے باوجود کوئی اللہ تعالیٰ سے باغی ہو جائے تو وہ راندہ درگاہ ہو جاتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو پالتے ہیں اور اپنی بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرماتے ہیں اور اپنی آیات ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

احساس و محسوسات، علم و معلومات سب کے سب آیاتِ الٰہیہ ہیں۔ ان سے انسان استفادہ کر سکتا ہے مگر ان کو وجود میں نہیں لا سکتا۔ مصنوعاتِ انسانی صفتِ عقلی ہیں لیکن نظامِ تخلیق اور ذاتِ مادہ انسانی دستِ قدرت سے بعید ہے اور وسعتِ فکرِ انسانی صرف اپنے حیطۂ امکان تک ہی گذر سکتی ہے۔ موجودات کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ کوئی عقل اس تک پہنچے یا رسائی حاصل کرے۔

مخاطب انسان کو چاہیئے کہ آیاتِ الٰہی جو دعوت دیتی ہیں۔ اپنے افکار کے ساتھ بر سبیلِ معلومات قبول بہ دل و جان کر کے اس کی مکمل تعمیل کرے اور اس طرح اس مقصودِ حقیقی تک پہنچے جو منتہائے تخلیقِ کائنات ہے۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ ان ہی آیات کو سمجھانے کے لیے بار بار انبیاء کرام علیہ السلام مبعوث ہوتے رہے اور تعلیماتِ الٰہیہ دستر خوانِ انسانیت پر پیش کرتے رہے۔ یہ اسبابِ انسانی ہدایت کے لیے مہیا کیے گئے۔ ارشاد فرمایا:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ

یعنی ہم نے ان کو دکھانے کے لیے آفاقِ عالم میں اپنی لاتعداد آیات پیدا کر دی ہیں اور ان کے وجودوں میں بھی آیات پیدا کر دی ہیں۔ تاکہ ان پر

حقانیت واضح ہو جائے۔ یہ ایسی اچھوتی آیات ہیں جو دست بُردِ انسانی سے آزاد ہیں اور ہمیشہ آزاد رہیں گی۔ کیوں کہ عقل و معقولات ادراک انسان کے لیے ہیں۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝

بے شک ہم نے انسان کے لیے دو راستے بتائے ہیں۔ ایک فرمانبرداری کا ایک نافرمانی کا۔ یعنی اطاعت میں تمہاری نجات ہے اور نافرمانی میں ہلاکت۔ تم کو شعور کے ساتھ ہدایت کے راستے بتائے گئے ہیں ان میں تمیز کرنا اور ہدایت پانا تمہارا کام ہے۔

مگر برخلاف اس کے لوگ خود اپنے نفس کے لیے نفع اور ضرر کی راہیں ڈھونڈتے ہیں اور اللہ کے بتائے ہوئے نیک اور بد میں تمیز نہیں کرتے۔ یہ بڑے ظلم کی بات ہے۔ معلوم ہوا کہ قضا و قدر تمہارے لیے ہے۔ تم قضا و قدر کے لیے نہیں، بلکہ تم خود اپنے لیے افتاد پیدا کرتے ہو جو سزا و جزا کا باعث بن جاتی ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہاں یہ گمان پیدا کرنا کہ وہ اپنے کسی فیصلے کو نہیں بدل سکتا۔ اللہ کی ذات کو عاجز گردانتا ہے اور ذاتِ باری ایسے نقائص سے منزّہ ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝

یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اپنے فیصلے اپنے علم و حکمت سے بدل سکتا ہے اور بدلتے ہوئے فیصلے بھی اس کا علم قدیم ہیں۔ ایک اور مقام پر صابعین کی شکرگزاری باعثِ ایزادِ رحمت بتائی گئی ہے۔ جو مالِ مقسوم پر مستزاد ہے فرمایا:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ؕ

"اگر تم انعاماتِ خداوندی کا شکر ادا کرو گے تو، ہم تم کو بہت زیادہ دیں گے۔" یہاں شکرانہ ماحضر کا بیان فرمایا۔ اور ہر مالِ ماحضر مالِ مقسومہ ہوتا ہے صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ اگر تم مالِ مقسومہ کا شکر ادا کرو گے۔ تو ہم تم کو تمہاری قسمت سے زیادہ دیں گے اور شکرانہ اہلِ ایمان کا ہوتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ مومن کی شکر گزاری تقدیر کو بدل سکتی ہے۔ یہ مقامِ سعادت ہے۔ اس واسطے مومن جہاں کہیں ہو اس کی سعادتوں سے قسمتیں بدل جاتی ہیں۔

مومن جس سرزمین پر تشکّر کے ساتھ چلتا ہے۔ وہ زمین بلند رتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ جہاں وہ عبادت کرتا ہے وہاں زمان و مکان سعید ہو جاتے ہیں۔ جہاں وہ آواز دیتا ہے۔ فضائیں بدل جاتی ہیں۔ وہ جس طرف توجہ کرتا ہے انقلاب آجاتے ہیں اور یہی مومن کی خرقِ عادت ہے حتیٰ کہ وہ نیکیوں کے ساتھ مقرّبِ خدا بن جاتا ہے۔

یہ ارتقائی منازل کی باتیں ہیں۔ جن کو انسان اپنی صلاحیتوں سے پا سکتا ہے۔ بخلاف اس کے جب وہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے خدا کی عطا کردہ رفعتوں سے گرنا شروع کر دیتا ہے تو وہ جہالت کی پستیوں میں کھو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس گمراہی کو وہ حقیقتِ زندگی تصوّر کرتا ہے۔ اور اپنی نفسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اسی پر زندگی تعمیر کرتا ہے۔ درحقیقت وہ اتباعِ نفس کرتا ہے۔ کہ وہ اسے دنیا کے اوجِ ثریّا تک پہنچا دے۔ دنیا کی دقیق ترین گتھیوں کو اپنے ناخنِ تدبیر سے کھولتا ہے۔ طاغوتی طاقتیں اس کے

سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہوتی ہیں اور وہ خشکی، تری، اور فضا و خلاء کی قوتوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔

لیکن یہ ارتقاء اپنے لیے تباہی و غارت گری، بے انصافی، ظلم و ستم اور عدوان لاتا ہے اور کائنات کی پریشانی، بلکہ ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ اس عروجِ خاکی میں نیکی کا خمیر شامل نہیں ہوتا۔ رضائے الٰہی شامل نہیں ہوتی ــــ پس معلوم ہوا کہ خالقِ فطرت صرف نیکی چاہتا ہے اور اس کی تائید فرماتا ہے۔

فطرت نیکی اور بدی کرنے میں کسی کا ہاتھ نہیں روکتی۔ البتہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا دیتی ہے۔ انسان کو یہ گلہ نہیں کرنا چاہیئے کہ قسمت نہیں بدل سکتی۔ بلکہ نیک ہو کر اللہ کی تائید سے قسمت کو بدل لینا چاہیئے۔ جس سے ایک جہان کی قسمت بدل سکتی ہے۔

خالقِ ارض و سما نے انسان کے اندر یہ توفیقات ودیعت فرما دی ہیں۔ شعور دے کر اس کے سامنے بلندیاں اور پستیاں رکھ دی ہیں۔ اب یہ اس کے اختیار میں ہے کہ جس طرف چاہے چلا جائے۔ لیکن اللہ کی منشاء یعنی پسند اور خوشنودی اس میں ہے کہ انسان بلندیوں کی جانب چلے تو ان میں عین رضائے حق اور منشائے الٰہی کو مقصود و منزل جان کر نجات پالے اور تقربِ حق سے سرفراز ہو۔

قرآن مجید کا نزول مبارک رات میں ہوا

قرآن مجید

خدا کا کلام ہے جو

کلامِ الٰہی ضابطۂ حیاتِ انسانی

بصورتِ کتاب اُترا ہے

ہے

قرآن مجید رمضان المبارک کے ماہِ طیبّہ میں لوحِ محفوظ سے آسمانِ دُنیا پر جملتہً وّاحدۃً نازل ہوا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ضرورت اور حالات کے مطابق سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصّلوٰۃ والسّلام پر نازل ہوتا رہا۔ ارشاد ہوا:۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ

ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن مجید اُتارا گیا۔ پھر فرمایا:۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ط

ہم نے اس کو مُبارک رات میں اُتارا۔ پھر فرمایا:۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ط ہم نے اس کو عزّت والی رات میں اُتارا

مذکورہ تینوں آیات میں قرآن مجید کا نزُول ماہِ رمضان المبارک ہی میں ثابت ہوتا ہے۔ لیلۃ القدر اور لیلۃ المبارکہ سے ایک ہی رات یعنی لیلۃ القدر مراد ہے اور لیلۃ القدر ماہِ رمضان المبارک ہی کی ایک رات ہے۔ یہ رات خارج از رمضان نہیں ہوسکتی۔ ماہِ رمضان اپنے ایّامِ معیّنہ اور اوقاتِ معیّنہ اور اپنے لیل و نہار کے لحاظ سے جزواً وکُلاً رمضان المبارک ہے۔ صرف صوم کا اطلاق خیط الابیض یعنی صبح کی سپیدی سے لے کر غسق الیّل تک ہے۔ یعنی مغرب کی پہلی سیاہی تک باقی اوقات مع صوم تابع رمضان ہیں اس اعتبار سے ماہِ رمضان المبارک کے کسی وقت میں جب بھی قرآن نازل ہوا، اس زمانۂ نزُول سے رمضان المبارک کا مہینہ ہی مُراد لیا جائے گا۔ لہذا:

اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اور اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ

سے شہرِ رمضان ہی مُراد ہوگا۔ اس کے لیے واضح دلیل یہ ہے کہ شہرِ رمضان کی آیت
میں قرآن مجید کا نام بیان کیا گیا ہے۔ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنْ یعنی ماہِ رمضان میں
قرآن مجید اُتارا گیا۔ ان دونوں آیات میں اَنْزَلْنٰہُ میں ہٗ کی ضمیر بیان کرکے اس قرآن
کی طرف اشارہ کیا ہے جو رمضان میں نازل ہوا۔ چنانچہ یہ دونوں آیتیں بھی شہرِ رمضان
میں نزولِ قرآن مجید کی تصدیق کرتی ہیں۔

جہاں تک لیلۃ القدر کی عزت وحرمت کا مسئلہ ہے۔ اپنے مقام پر بجا ہے۔ لیلۃ القدر
کی فضیلت قرآن وحدیث دونوں میں بیان کی گئی ہے۔ مگر نزولِ قرآن کے اعتبار سے
قرآن مجید کے تین مدارج ہیں۔ ایک قرآن کا لوحِ محفوظ میں رکھنا۔ دُوسرا لوحِ محفوظ سے
آسمانِ دُنیا پر ایک وقت میں سارے کا سارا نازل ہونا۔ تیسرا نزول علی الارض، اُس
مخصوص طبقۂ زمین پر جہاں رسُولِ مقبُول علیہ الصّلوٰۃ والسّلام بعثتِ نبوّۃ سے وصالِ مُبارک
تک رہے۔ ان جملہ تراتیبِ نزول کا منتہائے مقصود نزولِ قرآن علی نبیّ آخرالزّماں علیہ الصّلوٰۃ
والتسلیم تھا۔ اور آپ کے معتبر ذریعے سے انسانیّت تک پہنچانا مقصودِ مطلق تھا۔ جملۃً واحدۃً
رمضان المبارک کے لیلۃ القدر میں لوحِ محفوظ سے آسمانِ دُنیا پر اور آسمانِ دُنیا سے فتاً فوقتاً
اس دُنیا میں رسُول کریم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام پر نازل ہوتا رہا۔ منکرینِ اسلام نے اعتراض کیا تھا
کہ قرآن مجید ایک ساتھ سارے کا سارا کیوں نازل نہیں ہوا۔ اس کے جواب میں فرمایا:۔

لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا

یعنی اس واسطے قرآن مجید کو اکٹھا نازل نہیں کیا تاکہ آپ کا دِل مضبوط اور برقرار
رہے۔ یہ ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کا مطلب انسانیّت کے لیے ہدایت تھا۔ نہ کہ نزولِ محض۔
نزولِ محض سے افادے کا مقصودِ اختصاص نہیں ہوسکتا۔ ہدایت النّاس کا ترجمہ انسانی

معاشرہ کے جزوی و کلی اصلاح کے ساتھ رہنمائی ہے۔ فطرتاً انسانی ذہن فرداً یا اجتماعاً کسی طرح بھی ایک عظیم نصابِ تعلیم کا یکمشت متحمّل نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک فطری قاعدہ ہے کہ انسان تدریج کے ساتھ ہی علمی و عملی مدارج طے کر کے ارتقاء پاتا ہے۔ یہ ترتیب تعلیم انسانیّت کی فطری جبلّت ہے۔ چنانچہ پروردگارِ عالم نے اس حکمت و علم کے پیش نظر اپنے آخری رسُولِ پاک علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم پر آخری آئینِ فطرت یعنی قرآن مجید وقتاً فوقتاً موقع و محل کے لحاظ سے نازل فرمایا۔ تاکہ لوگ، اسے ذہن نشین کرتے چلے جائیں اور ذہن نشین کرنے کی حالت بھی ایسی ہو جب انسانیّت کا ایک ذہنی مقدّمہ اعتراض یا ضروری سوال یا ضروری مدّت کے مطابق ہو اور وہ مقدّمہ ذہن سے اُٹھ کر مجلس تک پہنچ جائے اور مجلس سے رسُولِ پاک علیہ الصّلوٰۃ والسّلام تک پہنچ جائے جو مسئولِ وقت ہیں اور پھر سائلین کو جواب کا بے قراری سے انتظار ہو رہا ہو۔

ایسی حالت میں جو بھی جواب آئے گا اِنکار و تصدیق دونوں حالتوں میں اس کا معاشرہ میں زیرِ بحث آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اور اس حکمت سے جو بات معاشرے میں نافذ کی جائے وہ زیادہ سے زیادہ یاد رہتی ہے۔ دُوسری صورت قلبی، ذہنی اعتراضات کی ہوتی ہے جو نبیؐ اللہ کے خلاف لوگوں کے دِلوں اور ذہنوں میں خاموشی کے ساتھ اُٹھتے ہیں اور ان کا معترضانہ سکوت جواب کا مطالبہ کرتا ہے یا ایک صورت سرگوشیوں کی ہوتی ہے جو منکرین اپنی مجالس میں بطورِ استہزاء کرتے ہیں۔ ان جملہ حالات میں مخالفین جواب کے طلبگار رہوتے ہیں۔

چنانچہ جب خفی و جلی حالات و مقدّمات کا الہامی کتاب کے ساتھ جواب دیا جائے تو یقیناً ایسے مقدّمات کے فیصلے عجیب و غریب ہونے کی بنیاد پر یاد رہتے ہیں۔ معترضین

ے لیے یہ یادگاری فیصلے ہدایت ثابت ہوتے ہیں اور منکرین کے لیے استدلال بن کر
وتِ حق کا قطعی ثبوت ہو جاتے ہیں۔ اس تدریجی نزول کی حکمت یہی ہو سکتی ہے کہ حضور
ہ الصّلوٰۃ والسّلام اطمینانِ وحی کے ساتھ انسانیت کو ہدایت سے مطمئن کر سکیں۔ قرآن مجید
ا کا کلام ہے جو بصورتِ کتاب اترا ہے۔ کلامِ الٰہی ضابطۂ حیاتِ انسانی ہے۔ اس کا
رالآباد تک بصورتِ کتاب رہنا ضروری تھا تاکہ انسانیت ہمیشہ اس سے ہدایت
تی رہے۔

یہ کتاب، کتابِ موعود ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہوا تھا اور اپنے وعدے
پورا کرتے ہوئے فرمایا:۔

ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ط

" یہ وہ کتابِ موعود ہے جس کا وعدہ کیا گیا تھا وہ نازل ہو چکی ہے۔ جس کی
صداقت و حقانیت میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ کتاب بالخصوص متقیانِ اسلام کے لیے ہدایت ہے۔"
جو اللہ تعالیٰ پر بن دیکھے، بن مس کیے، بن ٹٹولے ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے
ہیں اور اللہ کی راہ میں انفاقِ مال کرتے ہیں اور اس کتاب کے علاوہ پہلی کتابوں زبور
تورات، انجیل وغیرہ پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور وہ آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ یہ لوگ
فلاح پانے والے ہیں۔

اس کے علاوہ جو لوگ اِن عقائد کے خلاف ہیں یعنی نزولِ قرآن پر اور اس کی
بتائی ہوئی ہدایت پر ایمان نہیں لاتے وہ کافر ہیں۔ وُہ دیدہ دانستہ خُدا کی حقانیت
اور اُس کے نبیؐ کے بتائے ہوئے راستہ سے راہِ فرار ڈھونڈتے ہیں۔ لہٰذا ان کو
ڈرانا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں۔ کیوں کہ وہ تجاہلِ عارفانہ کرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ نبیؐ

اور اس کی لائی ہوئی ہدایت حق ہے مگر پھر بھی اپنے خبثِ باطن کے باعث انکار پر بضد ہیں۔

یہ لوگ جن کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر کر دی گئی ہے۔ نزولِ قرآن مجید نے حق و باطل کی حتمی نشان دہی کر دی۔ اس واسطے کہ قرآن مجید نزول البیان ہے۔ بیان اس کو کہتے ہیں جو حق و باطل میں تمیز کا ذریعہ ہو یعنی وہ ہر طرح ہر صورتِ باطل کی تردید کرتا ہو اور ہر طرح حق و صداقت کے اثبات میں دلیل لاتا ہو۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ○

"انسان کو پیدا فرمایا اور اسے صاحبِ بیان یعنی حق و باطل کی تمیز کرنے والا فرمایا۔"

قرآن مجید وہ بیان ہے جس کے ذریعہ انسانیت کے لیے ہدایت کا تعین ہوا۔ اور اس کی حتمی ہدایت کے ذریعہ باطل کی حتمی طور پر تردید ہوتی ہو۔ تدریج سے نازل ہو کر ہدایت کا باعث ہوا اور یہ وہ کتاب ہے جو ہمیشہ کے لیے غیر مبدّل ہے اس میں کبھی تغیّر و تبدّل نہیں ہو گا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ○

ہم نے ہی قرآن مجید کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے ہمیشہ کے لیے نگہبان ہیں۔ اس آیت سے قرآن مجید کا نزول ابدی ثابت ہوا۔ قرآن کریم اپنی اجمالی صورت کی خود تفصیل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا اس آیت میں قرآن مجید کا مفصّل ہونا ثابت ہے۔ یہ تفصیل آسانی سے ہدایت پانے کے لیے ہے۔ اس کے نزول کا مقصد تبلیغ ہے:۔

یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ ط

اے رسُول علیہ الصّلوٰۃ والسّلام جو کچھ ہم نے آپؐ پر نازل کیا اس کو لوگوں تک
[پہنچا]ؤ۔ یعنی اقوال و اعمال کے لیے امر بالمعرُوف اور نہی عن المنکر کرو۔ لوگوں کو بھلائی
[کی ط]رف بُلاؤ اور بُرائی سے منع کرو۔ یہی طریقہ تبلیغ اُمّتِ رسُولِ کریم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام
[کے]علمأ کے لیے تجویز کیا اور فرمایا :-

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
[وَ]يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط یعنی اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں ایک ایسے گروہ
[کا]ہونا ضروری ہے جو تم کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور پھر یہی طریقِ تبلیغ
[تما]م اُمّت کے لیے تجویز کیا اور فرمایا :- كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
[تَاْ]مُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط

اے اُمّتِ محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تم ہی سب اُمّتوں میں سے بہتر اُمّت
[ہو]۔ اس واسطے بہتر اُمّت ہو کہ تم لوگوں کو نیکی کی طرف بُلاتے اور بُرائی سے
[من]ع کرتے ہو۔

ان آیات سے معلوم ہُوا کہ نزُولِ قرآن مجید جماعت کے ساتھ تبلیغ چاہتا ہے
[او]ر جماعت کی تخلیق کرتا ہے اور قرآن مجید کی جماعت اُمّتِ محمد مصطفےٰ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام
[ہ]ے جو اپنے ختمی رسُول علیہ الصّلوٰۃ والسّلام اور ان کی ختمی ہدایت کے ساتھ عقائد، ختمی
[عب]ادات ختمی معاملات، معاشرت اور ختمی اخلاقیات رکھتی ہے اور یہ سب کچھ اُسے
[کتا]ب وسنّت سے مِلا ہے۔ نزُولِ قرآن آیاتِ جمیلہ کا مجموعہ ہے۔ جس کی عملی وعلمی تفسیر
[تشر]یح وتوضیح احادیثِ نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کرتی ہیں۔ چونکہ نزولِ قرآن کا مقصد ہدایت النّاس
[تھ]ا اور نزول من جانب اللہ ہو رہا تھا اور اس کے قاریٔ اوّل رسُولِ اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

رہی تھے ۔ آپؐ پر لازم تھا کہ آیات کا شانِ نزول بیان کریں اور اس کے نزول کا مقصد بیان کریں اور جن امور و اعمال کے لیے آیات نازل ہو رہی ہیں اُن کا صحیح تعین فرمائیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے لیے اسی قسم کی بات کرنی ہوگی جیسا کہ اس کے کرنے کا حکم ہے۔ ایک تو کلام الٰہی کی آیات ہیں جو آیاتِ جلیہ کی صورت میں نازل ہو رہی ہیں اور وہ قرآن مجید ہیں جن کو کسی طرح بھی کسی دوسری کلام کا جزو نہیں بنایا جا سکتا ہے نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ رسولِ پاکؐ کا کلام ہے حالانکہ بن دیکھے خدا کا کلام، بن دیکھی حالت میں بذریعہ وحی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہو رہا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خود ہی اس کے مصدق و مبیّن ہیں اور فرماتے جاتے ہیں کہ یہ کلام، جس کی میں قرأت کر رہا ہوں۔ اللہ کی جانب سے بذریعہ وحیٔ امین مجھ پر نازل ہوا ہے۔ کلام اللہ کا ہے مگر صوت کی صورت میں وہ کلامِ رسولؐ کا مقام بھی پا رہا ہے۔ لہٰذا ایسی حالت میں نزولِ کلامِ الٰہی کے ساتھ ساتھ اور قرأتِ کلامِ پاک کے ساتھ بیان پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو الگ حیثیت دینے کی بھی اشد ضرورت تھی۔ تاکہ قرآن مجید کو الگ کلامِ الٰہی کی صورت دی جائے اور کلامِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو الگ مقام دیا جائے چنانچہ :۔

مَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی

فرما کر حضور علیہ الصلوٰۃ کی حدیثِ لسانی کی وضاحت فرما دی اور نطقِ نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم مبرا عن ہواء النفس قرار دے کر اعتبارِ وحی کے ساتھ معتبر کر دیا تاکہ حدیثِ نبویہ کے بارے میں جو تفسیرِ قرآن مجید کے لیے معیار کی حیثیت رکھتی ہے اور نزولِ قرآن مجید کے ساتھ بالوحی ترجمان کی حیثیت رکھتی ہے کوئی شبہ نہ کر سکے۔

اسلام میں اس قسم کے کلام کو حدیثِ رسولؐ کہا جاتا ہے اور وہ آیاتِ خفیہ کی حیثیت میں ہیں۔ آیاتِ جلیہ کا ترجمہ آیاتِ خفیہ کے ذریعہ ہی زیادہ معتبر ہو سکتا ہے لہٰذا امتِ محمدیہ

علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے ضروری ہوا کہ وہ احادیثِ شریفہ کو آیاتِ الٰہیہ کے ساتھ تسلیم کرتے ہوئے جماعت بندی کریں۔ آیاتِ جلیّہ کتابِ الٰہی اور آیاتِ خفیہ سنّت ہو ہیں۔ اُمتِ محمدیہ کے لیے کتاب و سنّت پر ایمان رکھنا ضروری ہوا۔ قرآن مجید کی نزولی حیثیات کی حفاظت نزولِ احادیث کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ صاحبِ حدیث علیہ الصلوٰۃ والسلام آیات کی نزولی نوعیت کی وقتی حالت سے خبردار ہیں۔

شانِ نزول کے ساتھ ساتھ آیات کی تبلیغ کی ذمے داری بھی آپؐ پر ہے اور آیات کا سمجھانا بھی آپؐ ہی کے ذمہ ہے اور ایسی حالت میں خدانخواستہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی ان احادیث کو جو اللہ کی طرف سے ترجمانی کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اُتر رہی تھیں۔ ذریعۂ تفہیم نہ بناتے تو عوام الناس کلامِ خدا ہی کو کیونکر سمجھتے۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نزولی آیات کو صرف مکّہ اور مدینہ کے کسی مرکزی مقام سے پڑھ کر سُنا دیتے اور لکھ کر لوگوں کے در و دیوار پر آویزاں کر دیتے۔ معترضانہ سوالات کا جواب اپنے نطقِ مبارک یعنی حدیثِ شریف کے ساتھ نہ دیتے جو اس کلام کو جسے صرف نبیؐ اللہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دوسروں کے لیے بغیر حدیث کے سمجھنا عقلِ سلیم کے نزدیک مُحال ہے۔

اگر عام ہادیوں کا کلام بھی عوام کے لیے تشریح طلب ہو سکتا ہے تو پروردگارِ عالم کا کلام کیونکر تفسیر طلب نہ ہوگا۔ بالخصوص قرآن مجید کی تفسیر وہی ذات کر سکتی ہے جس پر قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ اس فطری اصول کے پیشِ نظر سنّت کا تعین کتاب کے ساتھ ضروری تھا تاکہ کتاب و سنّت لازم و ملزوم کی حیثیت سے جماعتِ محمدیّہ کے ساتھ بصورتِ آئین ہمیشہ جاری و ساری رہے۔ نزولِ قرآن مجید اللہ کی طرف سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ہوا اور اس کا نزول عالمِ اسباب میں ہوا اور عالمِ اسباب کے ذی شعور اور ذی کرامت گروہِ انسانی کی طرف ہوا اس کے لانے والے انسانیت کے مونس سرورِ کائنات رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ

احمدِ مجتبےٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہیں۔ جس کتاب کے بھیجنے والا خدا ہو۔ اور وصُول کرنے والے رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم ہوں اور جبرئیل امین جیسی عظیم المقام شخصیت قاصد کے فرائض انجام دے رہی ہو اور انسانیت جیسی مکرم جماعت کے لیے اُتر رہا ہو۔ ایسی کتاب کے ختمی آئینِ انسانیت ہونے میں کیا شبُہ ہو سکتا ہے۔

یہ وہ کتابِ مقدّس ہے جس کی پُرجلال جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کا نزُول پہاڑوں پر ہوتا تو وہ اس کی دہشت اور جلالت سے ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ انسانوں کی جماعت میں سے وہ جماعت کتنی خوش نصیب ہے جس نے کتابِ خداوندِ ذوالجلال کو رسُولِ خدا کے اعتبار پر تسلیم کیا اور اس نے دین اسلام کی جماعت میں شامل ہو کر کتاب وسنّت کی پیروکار ہوئی اور خیر الاُمّت ہونے کا اس نے شرف پایا ہوا اور اس کو خیر الامم ہو کر اعلائے کلمۃ الحق اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ کرنے کی دعوت دی گئی ہو۔

کتاب وسنّت کے عالمِ اسباب میں آنے کا مقصدِ عظیم یہ ہے کہ دینِ اسلام کی جماعت آئینِ فطرت کی روشنی میں زمان ومکان کا علم حاصل کرے۔ انفس وآفاق پر اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کی حیثیت سے ژرف نگاہی سے نظر ڈالے۔ اپنے خالق کی گوناگوں کرشمہ سازیوں کو سمجھے، ہیبت انگیز حالت سے رقت پیدا کرے، اپنی رُوح کو اللہ کی یاد سے مطمئن کرتا ہوا انفس وآفاق پر چھا جائے اور تسخیرِ روحانیات کے ساتھ تسخیر کائنات کرتا ہوا انسانیت کو اس کی کامل خدمت کے ساتھ دعوتِ حق دیتا ہوا حقیقتِ حقہ کے سامنے سربسجُود ہو جائے۔

وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغ

صاحبزادہ محمد افتخار الدّین احمد مدنی نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر آستانہ عالیہ خضریہ قادری فیض آباد راولپنڈی سے شائع کیا